رامپور کا جشنِ بہار

(۲)

RekhtaDownload.com

تذکرہ شعراء د
۸۰۰

رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز

Raza Library Rampur
RAMPUR
27.8.97

عابد رضا بیدار

پیش گفتار

محشر صاحب کے اعزاز میں آج کی تقریب کس ذیل میں ہے؟ نہ تو محشر صاحب رسالوں اخباروں میں چھپنے چھپانے کے شوقین نہیں کہ جلدی جلدی بچی روشنائی میں چھپ کے سب میں مشہور ہو جاتے اور ہر مشہور و معروف کا جشن منانے میں خود جشن برپا کرنے والوں کے کتنے ہی گفتی و ناگفتنی فائدے نکل آتے ہیں محشر صاحب دنیوی دولت و حشمت یا جاہ و منزلت کی بھی رائج الوقت سیڑھیاں نہیں طے کر پائے کہ ہر ہاتھ چڑھتے سورج کے سلام کو جھک جاتا۔ محشر صاحب تو اب باقاعدہ شاعر یا ادیب بھی نہیں رہے ہیں کہ عرصے سے کسانی دھندا ان کا تنہا شغل رہ گیا ہے۔

پھر بھی کچھ ایسی ہی بات ہے کہ جب اس تقریب کا سلسلہ چھڑا تو اکثر نے کل شام تک بھی یہ تو کہا کہ اسے ذرا اور تاخیر سے، تھوڑی اور مہلت کے ساتھ کیا جاتا تو زیادہ اہتمام ہو جاتا، تو زیادہ احباب اس میں شریک ہو جاتے، تو بیرونی قدر دانوں کا ایک بڑا گروہ بھی رام پور آ کر اس بزم میں شریک ہو لیتا ...... لیکن یہ کسی نے نہیں کہا کہ محشر صاحب اس تقریب کے شایان شان نہیں۔ سب نے کہا تو یہی کہ اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ آج رام پور میں محشر کے انداز کا کوئی دوسرا ہے نہیں۔ اس لئے بالکل بجا ہے جو اگر ان کے اعزاز میں جس سے جو بن پڑے کرے۔ لیکن میرے لئے تو سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ رام پور اور بیرون رام پور کم ایسے ہوں گے جو اعلیٰ درجہ کی نظمیں بھی لکھ سکیں، کلاسیکی انداز کی غزل بھی کہتے ہوں، درجۂ اول کے صحافی بھی ہوں۔

—— اسی درجہ کے مزاح نگار بھی ہوں! اور رنگ قدیم میں راسخ ہونے کے باوجود... نئے زمانے کے نئے افکار کے ساتھ نئے اسالیب کے صالح عناصر سے نہ بدکیں نہ چونکیں

بلکہ ویسی ہی سہولت کے ساتھ اس رنگ کو اپنانے پر بھی ایسے ہی قادر ہوں جیسے ہمیشہ سے ان کا شیوہ رہا ہو۔

ایسا versatile شاعر اور ایسی ہی versatile اور دلآویز شخصیت باوجود اپنی عزلت گزینی، لاپروائی، اور بے نیازی نے ہر ادبی ذوق رکھنے والے کے دل میں بسی ہوگی اور دل کی مستقل دستک اس سے کہتی رہے گی مجھے پہچانو، میرے مرتبہ کو پہچانو مجھے Recognition دو، اور اگر تم ایسا نہیں کرتے تو تمہارا ادبی ذوق خود تمہیں ملامت کرتا رہے گا اور تمہیں تمہاری اپنی نظروں میں نیچا گراتا رہے گا۔

اس وقت جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو میرے کانوں میں محشر صاحب کی کلاسیکی غزلیں بھی گونج رہی ہیں اور جدیدیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی انتہائی کامیاب شاعری بھی، "یہ کس طرف کو جا رہا ہے زندگی کا کارواں" قسم کی نظمیں بھی اسلم خاں کی ہار پر شدید کرب کا اظہار کرنے والا رزمیہ بھی ___ اور روشن ضمیر کے قلم سے مزاحیہ اخباری کالم بھی۔ اتنی رنگارنگی کے ساتھ اس وقت رام پور میں محشر کے سوا کس کا نام لے سکیں گے آپ؟ اور بیرون رام پور بھی کتنے ہیں!!

رام پور کے سلسلہ میں انجانے میں بے اختیار اکثر یہ دو مصرعے میری زبان پر رواں رہا کرتے ہیں:

تو مرا درد ہے سینے میں چھپا لوں تجھ کو
تو مرا خواب ہے آنکھوں میں بسا لوں تجھ کو

اور میرا ہی نہیں میرے تمام رامپوری بھائیوں کا یہی حال ہے نہ جانے کیا جادو ہے اس زمین میں کہ یہاں والوں کو تو چھوڑیئے یہ تو دوسروں کا دل بھی اس طرح موہ لیتی ہے کہ وہ بیشتر اپنا گھر چھوڑے رہتے ہیں۔

اس پیار کو ایک منظم و مخصوص شکل دینے کے لئے ۱۹۶۹ء سے ہم نے رام پور کا جشن بہار منانے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اکتوبر ۱۹۶۹ء میں پہلے جشن کا آغاز ہوا۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں نواب ناظم کے عرس پر یہ اہتمام اس اپریل ۱۹۷۱ء میں موجودہ رام پور کے اہم ترین شاعر و نثر نگار کے مزاز میں اسی نشست سے دوسرے جشن بہار کا آغاز ہوا۔

محمود رضوی

تذکرۂ محشر

محشر صاحب دانشوروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے اپنی زندگی میں بہت بڑے بڑے انقلابات کے اثرات کو دیکھا اور محسوس کیا ہے میری مراد پہلی جنگ عظیم دوسری جنگ عظیم اور ہندوستان و پاکستان کی تقسیم سے ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ کے بعد تو رامپوری حیثیت ایک مضبوط قلعہ کی طرح تھی جس کے چاروں طرف ریاستی پابندیوں کی گہری خندقیں تھیں۔ اس وجہ سے رامپور کا فنکار اس طرح نہیں سوچ سکتا تھا جیسے بیرون ریاست کا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد محشر صاحب اس اداس نسل کا ساتھ دیتے رہے ہیں جو تقسیم وطن کی تلخیوں کے نتائج دیکھ رہی ہے اور عبوری و تجرباتی دور سے گذری ہے۔ محشر صاحب ۱۹۰۸ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ مندرجہ بالا تینوں واقعات کا اثر ان کی شاعری پر پڑا لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد وہ اخباری دنیا میں زیادہ مصروف ہو گئے جس کا ان کی شاعری پر اثر پڑنا لازمی تھا۔ ادب اور جرنلزم میں سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ ۹ اپریل کا اخبار ۱۰ اپریل کو بیکار اور باسی ہو جاتا ہے اور ادب میں پائدار اور امر اقدار ہوا کرتی ہیں۔ محشر صاحب کے فن کو بھی اس المیہ کا سامنا کرنا پڑا صرف سوانح کی حد تک تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ محشر صاحب اخبارات سے بھی منسلک تھے لیکن ادب میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

رام پور کی ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ یہاں کے فنکار صرف [illegible] وہ ایک گوشہ نشینی

کر کے، اپنی تحقیقات شائع کرانے کے بھی چور ہیں۔ یہی کمزوری محشر صاحب کے ساتھ بھی ہے۔ ایک اس وجہ سے اور دوسرے ریاستی دور کے بعد اخبارات سے منسلک ہوجانے سے شاعری پر اثر پڑنے کی وجہ سے محشر صاحب اس ملک گیر شہرت کے مالک نہ بن سکے جس کے وہ مستحق ہیں۔ اخبارات سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد دنیاداری اور کاشتکاری کا بوجھ اتنا بڑھ گیا کہ شاعری کے لئے ہی وقت کم ملنے لگا شائع کرانے کی کس کو فرصت ہے۔

محشر صاحب نے عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم مدارس میں حاصل کی اور بعدازاں ذاتی مطالعہ نے جلا پیدا کردی۔ درس کے دوران میں منظومات سے طبعی ذوق اور فطری رجحان کے باعث سے مناسبت اور دلچسپی پیدا ہوئی موزونی طبع نے مشق و ممارست کی دعوت دی جودت نے اس فن کی موشگافیوں کے حل میں امداد دی۔ حافظہ کی پختگی نے اصول و ضوابط کو محفوظ کرلیا اور محشر صاحب کو فن عروض پر بھی عبور حاصل ہوگیا۔

لیکن پھر بھی محشر صاحب کے الفاظ میں "جلال کی عروض کا قائل نہیں لیکن پابندی ضروری سمجھتا ہوں۔ داغ کے زمانہ یا ان کے بعد کی متروکات کا بھی قائل ہوں۔

۱۹۲۲ء یعنی ۱۴ سال کی عمر سے محشر صاحب نے مشاعروں میں شرکت کردی۔ اس وقت کسی کو یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ لڑکا خود غزلیں موزوں کرسکتا ہے۔ محشر صاحب کو اپنی ابتدائی شاعری کے دو واقعات یاد ہیں۔ ۸ یا ۹ سال کی عمر میں کسی کا سہرا کہا اور اس میں "جور و جفا کا سہرا" پر مصرع بھی باندھ دیا جس پر ان کی والدہ نے تنبیہ کی اور تب انھیں احساس ہوا کہ شاید یہ الفاظ سہرے کے لئے ٹھیک نہیں یعنی جب الفاظ کے معنی بھی نہیں معلوم تھے اس وقت بھی صرف ادھر ادھر الفاظ پڑھ کر شعر موزوں کردیا کرتے تھے۔ تقریباً اسی عمر کا ایک شعر محشر صاحب کو اور یاد ہے جو انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی شاکر صاحب کو مخاطب کرکے کہا تھا۔

اے جان برادر تجھے غیرت نہیں آتی
شاکر ترے ہوتے ہوئے پانی کو میں ترسوں

ان کے بھائی نے پانی پلانے کو منع کردیا تھا۔ ۸۔۹ سال کی عمر سے اشعار کہہ رہے ہیں لیکن یہ کچھ یاد نہیں کہ ذوق کیسے پیدا ہوا؟ یا اور سمجھ لیجیے کہ شاعری کی بنیاد کوئی خاص واقعہ نہیں بلکہ فطری طور پر شاعری اور لطیف موزونی لے کر آئے تھے۔ خاندانی روایت

بھی شاعری کی محرک نہیں ہے کیونکہ والد صاحب بھی مولوی تھے اور ننھیال بھی مولویوں کے خاندان میں ہی تھی۔

محشر صاحب نے ابتدا ہی سے غزلیں کہنا شروع کیں۔ ۱۹۲۸ء سے محشر صاحب کی شاعری کا رنگ بدلا۔ ۱۹۲۸ء تک کا تمام کلام تلف کر دیا ہے۔ ۱۹۳۶ء سے شاعری کا رنگ پھر کچھ تبدیل ہوا لیکن یہ تبدیلی اس تحریک کی وجہ سے نہیں تھی جس کے لئے ۱۹۳۶ء عام طور سے مشہور ہے۔ لیکن اب سے محشر صاحب کی شاعری میں بھی روایت سے بغاوت ضرور شروع ہو گئی۔ داغ کے رنگ کے دور دورہ والی بات بھی تقریباً ختم ہو گئی۔ حالات و واقعات کا اثر شاعری نے قبول کرنا شروع کر دیا۔

محشر صاحب کے اساتذہ میں سب سے پہلے جناب صفدر علی خاں صفدر ساکن پل بخته کا نام آتا ہے جو مشہور حکیم بھی تھے۔ اس وقت تک محشر صاحب پروین تخلص کرتے تھے لیکن صفدر علی خاں کے مشورہ پر محشر تخلص اختیار کر لیا حالانکہ صرف دو تین غزلوں پر ہی ان سے اصلاح لی۔ اس کے بعد چند غزلیں صاحبزادے ہدایت علی خاں شہرت شاگرد داغ کو بھی دکھائیں اور پھر استاد رشید کی جانب رجوع ہوئے لیکن یہ تعلق زیادہ دن نہ چل سکا اور ۱۹۲۸ء میں جب محشر صاحب کی شاعری میں تبدیلی آئی تو وہیں سے استاد رشید سے اختلاف کی بنیاد پڑ گئی۔ ۱۹۲۸ء میں محمود علی خاں صاحب کو چند غزلیں دکھائیں اور بعد ازاں ۱۹۳۲ء تک نشتر سکندر آبادی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اس وقت نشتر صاحب نے فارغ التحصیل قرار دیدیا اور آخر میں محشر صاحب کے ذریعہ اصلاح کے لئے بھیجی گئیں چند غزلیں واپس بھی نہ کیں اور محشر صاحب کو جواب میں لکھ دیا کہ جب اچھے اشعار پڑھنے کو جی چاہتا ہے تو

تمہاری کوئی غزل پڑھنے لگتا ہوں۔ محشر صاحب کی کچھ غزلیں ۱۹۲۵ء، ۱۹۲۶ء میں نیرنگ رامپور میں شائع ہوئیں۔ اس وقت افسانہ نگاری کا شوق بھی تھا۔ ۱۹۳۰ء میں شرف زیدی کے "یگانہ" رام پور میں دو تین افسانے بھی شائع ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں بھی کاشتکاری کا جذبہ ذہن کے کسی گوشہ میں موجود تھا اس وجہ سے ہو نگر کے دیہاتی پنچایت کی ذمہ داری قبول کی۔ ۱۹۴۷ء میں روزنامہ آغاز سے متعلق ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء میں آغاز ویکلی ہو گیا اور ناظم روزنامہ ہی رہا محشر صاحب دونوں سے منسلک رہے۔ ۱۹۵۱ء کے بعد آغاز کے ادارہ سے مکمل طور سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن بے چین طبیعت سکون کے بجائے تلاش کرتی رہی ۵۲ء کے بعد کھیتی شروع کر دی اور ۱۹۵۳ء میں دوبارہ ناظم سے وابستگی اختیار کر لی ہے

تعلق ۱۹۵۵ء تک رہا۔ چند ماہ کے لئے ایک ہفتہ وار شیرازہ بھی نکالا۔ اخبارات میں روشن ضمیر کے قلم سے "پس پردہ" کے عنوان پر مزاحیہ وطنزیہ کالم تحریر کرتے رہے۔ اگر محشر صاحب صحافت کی جگہ اس صنف کو ادب مان لیتے اور کاروبار شوق جاری رہتا تو کوئی تعجب نہیں کہ اس دور کے بڑے طنز و مزاح نگاروں میں ان کا شمار ہوتا۔ اس زمانہ میں محشر صاحب نے غزلوں کے علاوہ سیاسی نظمیں بھی کہیں لیکن ان کی صرف وقتی اہمیت تھی۔ ویسے اس سے قبل بھی انھوں نے نظمیں کہی ہیں اور ۳۳، ۱۹۳۴ء میں چند نظمیں لاہور کے رسائل میں شائع بھی ہوئیں۔ محشر صاحب ۱۹۳۸ء میں میونسپلبورڈ کے ممبر رہے۔ ایک شاعر کا ممبری سے تعلق ۱۹۴۰ء میں بہ آسانی سمجھ میں آتا ہے جب وہ بالواسطہ طور پر سیاست میں شریک ہوگئے۔ طبیعت کا سیاسی رجحان انہیں سیاست میں لے آیا۔ ۵۳ء میں دوبارہ میونسپل بورڈ کے ممبر منتخب ہوئے۔ اور اس طرح محشر صاحب شاعری سیاست اور کاشت کاری کا ملا جلا نمونہ ہیں۔ محشر صاحب کی شاعری میں کہیں کہیں نظیر اکبر آبادی کی اور تخیل شاعری کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

محشر صاحب غزلیں اور نظمیں بڑے ذوق و شوق سے کہتے رہے ہیں لیکن گذشتہ ۱۰، ۱۲ سال سے جب سے اخباری دنیا سے فرصت ملی وہ غزلوں کی جانب زیادہ توجہ کرتے رہے ہیں۔ محشر صاحب نے "قصیدہ" اور "مرثیہ" کبھی نہیں کہا اور نہ اچھا کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس کیلئے ایک خاص رجحان طبیعت کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ رباعیات، قطعات تاریخیں سہرے اور نعت ہائے شریف بھی کہی ہیں۔ مستزاد کی طرف کبھی توجہ نہیں کی اور ان کے الفاظ میں "کہہ سکتا ہوں اور اچھی کہہ سکتا ہوں۔"

اساتذہ میں محشر صاحب میر۔ حاتم۔ تقی میر۔ غالب۔ مومن۔ جرأت۔ کو پسند کرتے ہیں لیکن محشر صاحب کے الفاظ میں "جہاں تک صرف غزل کے لغوی معنی کا تعلق ہے یعنی عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف۔ عورتوں کی زبان میں اس ضمن میں میں مومن جرأت اور نظام کو بڑا شاعر مانتا ہوں۔"

حسرت فانی اور اصغر کو بھی محشر صاحب اعلیٰ مرتبہ دیتے ہیں لیکن جگر کو اس پایہ کا شاعر نہیں مانتے۔ اختر شیرانی اور مجاز کے یہاں بھی غزلوں کی روانی کو پسند کرتے ہیں۔ فراق اور روش کو غزل کا اچھا شاعر مانتے ہیں اور جوش کو نظم کا۔ محشر صاحب کے خیال میں فراق کے یہاں سوز و تاثر اور تغزل زیادہ ہے اور روش کے یہاں زندگی۔

فراق کی شاعری کی موجودہ روش کسی بھی تعلیم یافتہ شخص کی طرح محشر صاحب کو بھی پسند نہیں۔

محشر صاحب کے مندرجہ بالا جملے جرأت مندانہ ہیں جو خود اعتمادی کے غماز ہیں۔

رامپور کے شعرا میں محشر صاحب نظام غفلت اخوان زادہ (جہاں تک پڑھا ہے) کرم خاں، حکیم عبدالہادی خاں وتخسا، عابد حسین اوج، ناظم راز یزدانی، رشاد عارفی، پیارے خاں راز، بیمار اور اشک کو عالی مرتبہ شاعر مانتے ہیں۔ محشر صاحب کے خیال میں محمود علی خاں کے یہاں شاعرانہ غلطیاں یا سقم نہیں اور یہ بھی کہ اصلاح بہت اچھی دیا کرتے تھے۔

محشر صاحب کا رامپور کے میدان شاعری کے بارے میں عقیدہ یہ رہا ہے کہ رام پور میں بیک وقت جتنے اچھے شاعر رہے اور ہیں اتنے کسی ایک وقت میں کسی بھی دوسرے شہر یا بستی میں نہیں رہے۔

محشر صاحب اپنے اشعار کا آسانی سے انتخاب نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے خیال میں ہر اولاد ماں کو پیاری ہوتی ہے۔

محشر صاحب کے خیال میں غزل کو حسین اور معیاری بنانے کے لئے رفعت تخیل (۲) اسلوب ولہجہ (۳) الفاظ کی مناسبت و یکسانیت (۴) بندش کی چستی ضروری ہے۔

غزلوں میں استادی کے بھی قائل ہیں لیکن صرف اس حد تک کہ اس سے پختگی ظاہر ہو نہ یہ کہ شعر صرف استادی کا نمونہ بن جائے۔ مثلاً محشر صاحب نے یہاں عابد حسین اوج کا یہ شعر اپنی تائید میں سنایا ؎

سر کے بل آیا تری تیغ نظر کے سامنے کچھ نہ سوجھا لذت درد جگر کے سامنے

محشر صاحب اپنی شاعری میں دہلی اسکول کے تتبع کے قائل ہیں لیکن رامپور کے لہجہ اور انداز کو جگہ دینا باعث فخر سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ لکھنؤ اسکول کو رامپور کے بعد یعنی تیسرا نمبر دیتے ہیں اور لکھنؤ اسکول کی استادی کو کسی خاص شاعرانہ امتیاز کا حامل نہیں سمجھتے بلکہ شاعری میں رامپوری لب ولہجہ اور معاشرہ کی نمائش کو اس پر فوقیت دیتے ہیں۔

اس بیان کی تائید میں محشر صاحب نے چند اشعار سنائے آپ بھی محظوظ ہوں۔

ہزاروں گالیاں وہ دے رہے تھے بے خطا مجھ کو (محمود علیخاں)
جو پوچھا بات کیا ہے جل کے بولے بات کیا ہونی

اس شعر میں ٹھیٹھ ان ولی ہے اور رامپوری لہجہ ہے۔ ناظم کا شعر ہے۔

کر کے خوں ایک کا جا بیٹھے ہیں گھر میں اور پھر
پوچھتے ہیں یہ مرے در پہ ہے غوغا کیسا

مانا کہ نہ بیمارِ محبت کو شفا ہو
آخر وہ مرض کیا ہے کہ تم جس کی دوا ہو
(آغا غنی)

بیرونِ رام پور سے بھی جو شاعر رامپور آئے ان کے یہاں بھی رام پوری لب و لہجہ اور معاشرہ کہیں کہیں نمایاں ہو گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس انداز میں سطحیت نہیں بلکہ گہرائی ہے اس ذیل میں محشرؔ صاحب نے مندرجہ ذیل اشعار سنائے۔

ڈرتا ہوں اس انداز پہ ہر چند سر اڑ جائے جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
(غالب)

وعدہ آنے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سونپی ہے میرے در کی دربانی مجھے
(غالب)

میں داورِ محشر سے بہت داد طلب تھا وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے نکل کر
(داغ)

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی
(داغ)

شاعری میں محشرؔ صاحب کو کاوش ناپسند ہے اور ترقی پسندی میں جو بے اصولی برتی گئی اس کے بھی خلاف ہیں۔ شاعری میں شعری پابندیاں بحر اوزان وغیرہ لازمی سمجھتے ہیں ورنہ شعر گفتن چہ ضرور نثر ہی کیوں نہ لکھی جائے۔ جدیدیت کے بارے میں محشرؔ صاحب کا خیال ہے کہ انداز نیا اور اچھوتا پن ضرور ہے لیکن تاثر کم ہے اور وہ تاثر بھی جہاں کہیں ہے صرف واہ والا ہے آہ والا نہیں۔ جدید نظموں کی کوئی عمر نہیں البتہ جدید پابند غزلیں اپنا مقام ضرور بنائیں گی۔ نظمیں جو زندگی سے متعلق ہیں مثلاً جوشؔ کی نظم کسان وہ بھی زندہ رہنے والی ہیں۔

زندگی کے بارے میں محشرؔ صاحب کا عقیدہ ہے کہ عزتِ نفس کو ٹھیس نہ لگنا چاہئے۔ موجودہ معاشرہ کی دوڑ کوئی بہتری کی علامت نہیں۔

رازیزدانی مرحوم

محشرؔ عنایتی

احمد رضا خاں کے بیٹے صابر رضا خاں شاعری شروع کی تو محشرؔ بن گئے۔ رامپور کے مشہور بزرگ الحاج حافظ عنایت اللہ خاں مرحوم نقشبندی مجددی سے خاندانی نسبت تھی اس لئے عنایتی کہلائے۔ محشرؔ عنایتی ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۱۸ء یعنی گیارہ برس کی عمر سے شاعری شروع کر دی۔ شروع میں کچھ غزلیں صفدر علیخاں صفدرؔ منجم کو دکھلائیں بعد میں ۱۹۲۲ء میں منشی رشید احمد خاں رشیدؔ جانشین حضرت محمود کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے یہ سلسلہ صرف ۶ سال چلا اس لئے داغؔ دہلوی کا رنگ، محشرؔ کے استاد جس کے رسیا تھے اس نئے ذہن کو آسودگی نہ دے سکا اور ان کی حقیقت پسندی اور بلند خیالی استاد سے علیحدگی کا موجب ہوئی۔ بعد میں کچھ غزلیں حضرت محمود کی خدمت میں پیش کیں لیکن یہاں بھی یہی شکل تھی بالآخر نشترؔ مقتدری سکندر آبادی پر جو ان دنوں رام پور میں مقیم تھے نظرِ انتخاب پڑی لیکن یہاں سے یہ جلد ہی فارغ الاصلاح قرار دیئے گئے۔ حضرت محشرؔ اس دور کے تسلیم شدہ استاد ہیں اور ان کا حلقۂ تلامذہ بہت وسیع ہے۔ آپ کے تلامذہ میں علی شاہ خاں جامؔ۔ جناب واحد القادری رئیس رام پوری۔ اعجاز راہی اوجین۔ بزمی رام پوری۔ محمود میاں نسیمؔ نظامی جعفر مراد اور خورشید منظر قابل ذکر ہیں۔

انتخاب کلام

جب مصلحت تھپک کے سلا دے جنون کو
پھر زندگی جنونِ وفا کے سوا ہے کیا

ارادۃً تو انہیں ایک بار دیکھا تھا
وہ بار بار نظر خود ہی آئے یہ کیا تھا

الزام ان پہ یہ ہے کہ پیہم ستم کیے
احسان ان کا یہ ہے کہ جینا سکھا دیا

عقدۂ عشق کو سوچیں تو فرشتے بھی مگر
اس کا حل جرأت انساں کے سوا کیا ہوگا

خوشا وہ بزم جو خواب و خیال ہو جائے
مگر وہ عالم خواب و خیال کیا ہوگا

ابھی غم کو سمجھ بیٹھے گا مقصودِ تمام اپنا
دلِ ناعاقبت اندیش کیا جانے مقام اپنا

اگر اپنے دلِ بیتاب کو سمجھا لیا میں نے
تو یہ کافر نگاہیں کر سکیں گی انتظام اپنا

جہانِ عشق میں ایسے مقاموں سے بھی گزرا ہوں
کہ بعض اوقات خود کرنا پڑا ہے احترام اپنا

جہاں سے مصلحت کے تحت اٹھوایا گیا ہوں میں
وہاں اک یہ بھی پہلو تھا کہ ان کا آستانہ تھا

گلستاں میں نہ جانے کتنے تنکے جا بجا ہوں گے
مگر وہ چند تنکے نام جن کا آشیانہ تھا

کل جو آندھی کے ساتھ بادل چھائے
مجھ کو دھیان آگیا جوانی کا
صبحِ محشر ذرا خیال رہے
رخ نہ بدلے مری کہانی کا

یہ چمن کے رہنے والے گل و غنچہ جن کی دنیا
جو قفس میں رہ کے دیکھیں تو چمن کو بھول جائیں

کھٹکا سا لگا ہوا ہے دل کو
جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے

Rekhta download.com

میں تو تنہا ہی مگر اہلِ گلستاں محشرؔ
واقف رازِ بہاراں تو ہوئے مرے بعد

اچھا، نویدِ بخشش پیہم بھی دے کوئی
لیکن ذرا مذاقِ گنہگار دیکھ کر

چاند کو کوئی کس طرح دیکھے
آپ تو یاد آئے جاتے ہیں

کیا ہوا محشرؔ کو کیوں ہنستا نہیں
کوئی اتنا پوچھنے والا نہیں

ہم نے انھیں بہار سے تعبیر کر دیا
جو حادثے تھے سمر[illegible] کے گلستاں میں آ گئے

انسان کی منزلیں ہیں نہ جانے کہاں کہاں
دیکھو مرا ضمیر کہاں ہے زباں کہاں

ہے اصل میں تو غمِ دوست حاصلِ کونین
نہیں تو پھر غمِ کونین ہی غنیمت ہے

شکایتِ غمِ دوراں تو عام بات ہوئی
مجھے تو ان سے کچھ سوا بھی کہنا ہے

رباعیات و قطعات

جھلتی ہے ثمر دار ہر ایک شاخِ درخت
لیکن یہ شکم سیر یہ نہ اہلِ زر و تخت

"کچھ راہ خدا میں" ارے تو پھر آیا
"سرکار میں بھوکا ہوں" نکل جا بدبخت

بدمست شرابی مری منزل کو نہ دیکھ
کیا سمجھے گا تو میرے نفدئل کو نہ دیکھ

ہاں دیکھ یہ تسبیح یہ داڑھی یہ عبا
دل دیکھے گا، لے دیکھ، مگر دل کو نہ دیکھ

ایمان کے سائے میں نہ کہ خواہش زر
اللہ سے ڈرتا ہے ٹروین سے ڈر
"ہاں ٹھیک ہے سرکار" تو لے نوٹ ہیں یہ
"یہ کفر ہے سرکار" تو جا۔ فاقے مر"

کسی بنجر زمیں کا پیڑ ٹھنٹھل
فرشتوں نے کئی سو سال ریتا
نہ جب ممکن ہوا انسان بننا
تو اس ڈھولک کا رکھا نام نیتا

یہ آنکھ نم ہے وہ آنکھ نم ہو یہ چہرہ فق ہو وہ چہرہ فق ہے
یہ نامرادی کی داستاں ہو وہ تشنہ کامی کا اک ورق ہے
کمال یہ ہے کہ پتے پتے کلی کلی پر ہر اک کا حق ہے
مگر جہاں حق کی بات دیکھی وہیں اثر ناگوار دیکھی
بس اے فریب امید راحت، بہت دنوں انتظار دیکھا

اندھیرا آنکھوں میں چھا گیا ہے تو روئی ریشم کی دھن چکا ہوں
پسینہ ایڑی تک آ گیا ہے تو تار چاندی کے چن چکا ہوں
کلیجہ زہراب ہو گیا ہے تو جب یہ کمخواب بن چکا ہوں
نہ سانس لی تھی ابھی کہ اس کا لباس دیکھا سنگھار دیکھا
بس اے فریب امید راحت بہت دنوں انتظار دیکھا

یہ لہلہاتی سی کھیتیوں کے وہی شہنشاہ ہیں جو بوئیں
یہ چشم افروز اطلسوں کے وہی سزاوار ہیں جو غم لیں
یہ تیز رفتار موٹروں کے وہ مستحق ہیں جو جان ماریں
یہ اب نہ ہوگا اسی کو کچلا جو بیکسی کا شکار دیکھا
بس اے فریب امید راحت بہت دنوں انتظار دیکھا

(نظم کروٹ سے)

رئیس رامپوری

میرے اُستاد

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوآں
ہر کجامی نگری انجمنے ساختہ اند

نیظری نے جس وقت یہ شعر کہا ہوگا اس وقت یقینی طور پر اسی کے سامنے اپنے محبوب کا ایک آفاقی اور ہمہ گیر تصور ہوگا، لیکن شعر کی افادیت اور مقصدیت وقت کے تقاضوں کے ساتھ ڈھلتے ڈھلتے اور عہد بہ عہد نسل بہ نسل سفر کرتے کرتے آج ایک ایسی منزل پر پہنچی کہ بلاشبہ نیظری کو صرف وہی نہیں سینے سے لگانے کو دل چاہتا ہے شخصیات نے تاریخ پر بڑا اثر ڈالا ہے خواہ وہ فلسفیانہ حیثیت کی حاصل ہوں یا شاعرانہ۔ تاریخ کے اوراق ان کو اپنے سینے سے لگائے عہد کے تقاضوں کے ساتھ مائل بہ سفر رہتے ہیں۔ وقت بدل جاتا ہے تقاضے بدل جاتے ہیں، لیکن تاریخ کے اوراق میں ان شخصیات کا جادو چڑھ کے بولتا رہتا ہے۔

یہ بھی تاریخ ہی کی ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ یہاں بیشتر واقعی فنکاران علم وادب کو ان کی حقیقی قدر شناسی سے قطعِ نظر، دادِ فن کے طور پر بھی بہت کم حصہ مل پاتا ہے۔ زندگی بھر وہ جس کش مکش اور ذہنی تنہائی کا شکار رہتے ہیں اس کے پیشِ نظر ان کا مستقل فن کی راہ میں ایثار ایک ایسا کارنامہ ہے جسے خونِ جگر سے لکھا جانا چاہیئے۔

میرے وطن کو اس معاملہ میں طرۂ امتیاز حاصل ہے۔ یہاں نہ جانے کتنے حقیقی فنکار اور علم و ادب کے خورشید باوجود اپنی پوری آب و تاب کے لوگوں کی ناقدر شناسی کا شکار ہوئے ہیں، اور ہو رہے ہیں۔

چشم شپر اگر سیاہ شود
چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

آمدم برسرِ مطلب۔ حضرتِ محشر عنایتی جو رامپور کے وہ مایۂ ناز فرزند ہیں جن پر

اس اسکول کو ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے بجا طور پر ناز رہے گا۔ مگر انھوں نے اپنے فن کی واقعی داد تو کجا ناقدرشناس زمانے کے ہاتھوں وہ مصائب برداشت کئے کہ یہ کچھ انھیں کا قلب جانتا ہوگا ورنہ ان کا مقام علم و ادب کی دنیا میں ایک اچھے اور اسلوب طراز شاعر ہونے کی حیثیت سے نہایت ارفع و اعلیٰ ہے وہ اپنی خودداری طبع اور گوشہ گیری کے اتنے عاشق ہیں کہ ان کے اپنے ہی استاد حضرتِ رشید رامپوری کے بقول ؎

قدر کیا اہل زمانہ کو ہماری ہو رشیدؔ
ہم کہیں بن کے سخنداں کبھی آئے نہ گئے

وہ اس دور کے ان تمام غلط اور بے جا پروپیگنڈے سے بے نیاز اپنی گوشہ گیری میں ہی خوش ہیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے شعری تاریخ میں نہ صرف یہ کہ نئے باب کا اضافہ کیا بلکہ اُردو شاعری پر بعض الزامات جو مخالفین کی طرف سے عائد کئے جاتے تھے ان کا بھی ازالہ کر دیا۔ حضرت محشر عنایتی ویسے تو غزل کے شاعر ہیں لیکن، انھیں تمام مروجہ اور یہاں تک کہ غیر مروجہ اصنافِ سخن پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔
ابھی حال ہی میں جو انھوں نے بے شمار رباعیاں کہی ہیں ان کے پیش نظر وہ اُردو شاعری کو اس منزل پر لائے ہیں، جہاں آج تک کسی کا ذہن اس وضاحت سے نہیں گیا ہے دیومالائی علامتوں کو رباعی میں استعمال کر کے انھوں نے "گوری" کی مختلف کیفیات کو جس انداز میں نظم کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے ان میں سے چند بطور نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

پانی جو بھرے نغمہ کناں ہو جائے
بجھ جائے جو خار لاتے لاتے گاگر
بوڑھوں کی نظر نظر جواں ہو جائے
تلوے کی طرف دیکھے کماں ہو جائے

جاگے تو قیامت سی اٹھائی جائے
بادل کی گرج میں جیسے دھیرے دھیرے
چکی پیسے تو گنگنائی جائے
جوگن کوئی بانسری بجاتی جائے

بوسیدہ سے کپڑوں میں جوانی کا سجاؤ
گوری میں تکلف نہ تصنع لیکن
اُلجھے ہوئے بالوں میں قیامت کا بناؤ
زاہد بھی جو دیکھے تو کہے مجھ کو بچاؤ

موسل دھمکے ہر ایک چوڑی کھنکے — دانوں کو سمیٹے ہیں پائل جھنکے
دھانوں کی کٹائی کا ترنم توبہ — جس طرح پکھاوج پر مجیرا جھنکے

تتلی اُڑتے میں رک سی جائے جیسے — آندھی چلنے میں سرو جھولے جیسے
کل صبح وہی بلور ہی تھی گوری — بارش کی جھڑ میں مور ناچے جیسے

علاوہ ازیں حضرت محشر عنایتی ایک منفرد نثار اور صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے بھی کافی شہرت رکھتے ہیں، ویسے ان کی کوئی باقاعدہ تصنیف نثر میں تو نہیں ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ انھوں نے مدتوں روزنامہ آغاز اور روزنامہ ناظم میں اپنے نثر کے جوہر دکھائے ہیں وہ ان کی اس میدان میں بھی فنکارانہ صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں۔

مزاج کی شگفتگی اور طبیعت کی جولانی کا یہ عالم ہے کہ محفل کو ایک لمحے میں چاہیں تو قہقہہ زار بنادیں اور چاہیں تو اہل بزم کو دوسرے ہی لمحے رونے پر مجبور کردیں۔ یہ فن ان کی طبیعت اور طباعی دونوں کو اجاگر کرتا ہے۔

حضرت محشر عنایتی ایک شخصیت بھی ہیں ایک انجمن بھی، ان کی خلوت بھی جلوت ہے اور جلوت بھی خلوت، اُستاد داغ کے گھرانے کے اس فرزند جلیل نے اپنے مزاج کو شعری پیمانے کے تناسب سے روایت کا اسیر نہ رکھ کر اپنا ایک نیا انداز اور نیا اسلوب تراشا ہے۔ بلاشبہ یہ انتہائی دیدہ ریزی کا کام ہے۔ بقول غالب ؎

"قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا"

خدانے حضرت محشر عنایتی کو دیدۂ بینا اور طبع جدت طراز سے نواز کر اُردو شعر وادب کو ایک گوہر گراں مایہ بخشدیا۔ زندگی سے بھرپور کیفیات اور علم سے معمور تشبیہات ان کے کلام کا خاصہ ہیں۔ حضرت محشر عنایتی کی عمر شاعری نصف صدی سے تجاوز کر گئی ہے۔ اور بقول حفیظ جالندھری ؎

"تشکیل و تکمیل فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
وہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں"

اس لئے اس وقت حضرت محشر عنایتی فن کی ان بلندیوں پر ہیں جہاں اچھے

RekhtaDownload.com

اچھوں کے پر جلتے ہیں۔ انھوں نے اپنے رنگ سخن کو ایسا نکھار اور ایسا کیف انگیز سحر بخشا ہے جو رہتی دنیا تک شعری تاریخ میں زندہ و جاوید رہے گا۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں جو سب سے نمایاں بات ملتی ہے وہ ان کی انفرادیت ہے۔ مثلاً

بہار باغ کا منہ چومتی ہے میری بربادی
کہ پھولوں پر پڑی ہے خاک میرے آشیانے کی

حضرت محشر عنایتی نے جس خوب صورت ڈھنگ سے اس مضمون کو نظم کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ کیا رعنائیں ہیں سبحان اللہ۔ ایک جگہ اور فرماتے ہیں ؎

کیا بتائیں کتنی تھی کائنات کی وسعت
رات ان کی یادوں کو مل گئے تھے ہم تنہا

آپ نے ملاحظہ فرمایا "کائنات کی وسعت" ایک سوالیہ نشان اور تیکھا طنز بھگر۔ پہلے مصرع میں جو نشتریت پیدا کر رہی ہے وہ بلاشبہ حضرت محشر عنایتی جیسے قادر الکلام اور نکتہ رس شاعر کا حصہ ہے۔ ایک شعر اور ملاحظہ فرمائیے۔

طبیعتوں میں بڑا اختلاف ہوتا ہے
مجھے تو عرض تمنا پہ شرم سی آئی

کیا جواب ہوسکتا تھا اس شعر کا۔ خاص رامپوری انداز وہی مرکز وہی احتیاط وہی خودداری اور کیا کیا کچھ۔ مومن خاں مومن یاد آگئے ؎

نہ ایما، خواہش نہ اظہار مطلب
مرے منہ کو اہل کرم دیکھتے ہیں

مگر ع

طبیعتوں میں بڑا اختلاف ہوتا ہے

جہاں زبان کھلتے ہیں، وہاں بھی اپنا لوہا بغیر منوائے نہیں رہتے ؎

بڑے بھولے بڑے سیدھے کہیں کے
ذرا دیکھے تو دیکھ آستین کے
چلو پابند ہی رہنا نہیں کے
مگر یہ بل بھی جائیں گے جبیں کے

حضرت محشر عنایتی کا دائرۂ تلمذ بھی انتہائی وسیع ہے، بیشتر شعرا اس وقت ان کے دامن سے منسلک ہیں، جن میں سے اکثر خاص شہرت رکھتے ہیں۔ حضرتِ محشر عنایتی کی خدمت اور ان کے دامن سے وابستگی پر مجھے بھی انتہائی فخر ہے۔

Rekhta Download.com

ذکا صدیقی

گوری نامہ ـــــ محشر کا شاہکار

طنز کی طرح رباعی بھی ایک دودھاری تلوار ہوتی ہے، یا اپنا گریباں چاک، یا دامن یزداں چاک۔ چار مصرعوں میں ایک جہانِ معنی کو سمیٹ لینا آسان کام نہیں ہوتا اور ان چار مصرعوں میں بھی چوتھا مصرعہ جس پر مضمون کی اساس ہوتی ہے اگر ذرا سست ہو جائے تو شاعر کی ایک عمر کی کمائی جنس کاسد سے ناروا تر ہو جاتی ہے۔ اسی لئے شاعر اس وقت تک رباعی کہنے پر آمادہ نہیں ہوتا جب تک اس کی مشق ایک خاص معیار تک نہیں پہنچ جاتی لیکن مشق سخن کا ایک خاص معیار تک پہنچ جانا بھی اس امر کی ضمانت نہیں ہوتا کہ رباعی بہرحال کامیاب ہوگی۔ اس کے ۲۴ اوزان جو بظاہر رباعی گوئی کو آسان بناتے دکھائی دیتے ہیں بڑے خطرناک ہیں۔ بڑے سے بڑا استاد رباعی کہتے وقت جیسے تلوار کی دھار پر چلتا ہوتا ہے۔

ہشدار کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را

ذرا آنکھ جھپکی اور چوبیس کے چوبیس اوزان کی زمین شاعر کے قدموں سے نکلی!
غالب ہمارے اہم ترین شاعروں میں ہے۔ وہ بھی جب رباعی کہتا ہے تو ایک جگہ توازن کھو بیٹھتا ہے:

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ ۔۔۔۔۔ دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں ۔۔۔۔۔ سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

مولانا نظم طباطبائی نے کہا کہ دوسرا مصرع "دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب" غلط ہے۔ اس میں ایک سبب زیادہ ہے۔ مولوی نجم الغنی رامپوری نے جواب دیا کہ یہ کہنا کہ دوسرا مصرع رباعی کے وزن ہی میں نہیں ہے، غلط ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ عروضی نقطۂ نظر سے دوسرے مصرع میں ارکان کی نشست غلط ہو گئی ہے یعنی مفعول، مفاعلن فعولن فعلن کے وزن میں دوسرا مصرع اگر مفعولن فاعلن مفعولن فعلن ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔
اس بحث سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ غالب جیسا قادرالکلام شاعر بھی رباعی

کتنے وقت فروگذاشت کر سکتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو شاعر وہی ہوتا ہے جو کبھی کبھار اوزان مقررہ کی پابندی کو مفہوم کے حسن پر قربان کر دیتا ہے۔ اگر غالب یہ کہے کہ دل رک رک کر بند ہوگیا ہے غالب تو طباطبائی کے نزدیک مصرع موزوں ہوتا لیکن محاورے کا خون ہو جاتا۔ محاورہ ہے "رک رک کر"۔

دراصل اچھے اور حقیقی شاعر کے لئے رباعی کے چار مصرعے جو بظاہر اظہار معانی کیلئے ناکافی ہوتے ہیں ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اعلیٰ، نازک اور لطیف مضامین واحساسات کو صرف چار مصرعوں میں ادا کرنے کے لئے کوزے میں دریا کو سمادینے والی مہارت واستادی درکار ہوتی ہے یہی وہ موقع ہوتا ہے جب اہل نظر شاعر کو پرکھتے ہیں۔ فارسی اور اردو کے ہر بڑے شاعر نے اس چیلنج کو قبول کیا ہے۔ بابا طاہر، عبداللہ انصاری، خیام، مولانا روم، سرمد وغیرہم کی رباعیاں فارسی میں اور میر، انیس، حالی، امجد حیدرآبادی، جوش، فراق وغیرہ کی رباعیاں اردو میں، ان شاعروں کی سرکش انا کی مظاہر ہیں۔ ان شعرا کی رباعیوں کو موضوع کے لحاظ چند اصناف میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

وجدانی، عشقیہ، طبیعی، خمریہ، فلسفیانہ۔

ایک میدان خالی تھا۔ اس کو دریافت کرنا اور اس میں

کی حاکمیت کا اعلاق کرنا حضرت

محشر عنایتی کیلئے مقسوم ہو چکا تھا۔ آج کی محفل میں محشر صاحب کی ان رباعیوں کا جائزہ لینا اور محشر صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنا میرا مقصود ہے۔

محشر صاحب رامپور کے ان نامور شاعروں میں ہیں جن کا کلام کم از کم ہمارے صوبے کے اہل سخن کے لئے محتاج تعارف نہیں۔ ان کا عشقیہ کلام سب کی نظر میں ہے۔ فکاہیہ کلام سے ان کے احباب واقف ہیں۔ اور سیاسی شاعری سے اخبار بین حضرات لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی رباعیاں جن کی ہم لوگ گوری نامہ کے عنوان سے فرمائش کرتے اور سنتے ہیں اردو شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں۔ گاؤں کی سادہ معصوم زندگی کی جیتی دلکش تصویریں محشر صاحب نے ان رباعیوں میں پیش کی ہیں وہ، بلا مبالغہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ اردو میں شاذ کا درجہ رکھتی ہیں۔

رامپور کے ادبی حلقوں نے پچھلے چند سال میں محشر صاحب کی شہر سے غیر حاضری کو برابر محسوس کیا ہے۔ لیکن وہ جب جب اپنے گاؤں سے شہر آئے اپنے ساتھ گاؤں

کی کنواری اور اچھوتی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو گوری نامہ کی رباعیوں کی صورت میں ہمارے لئے بطور تحفہ لائے۔ چیز نئی تھی، ادبی حلقوں نے ان رباعیوں کو حیرت کے کانوں سے سنا اور محبت کے دل میں جگہ دی۔ ان رباعیوں میں ہندوستان کا دل دھڑک رہا ہے یہاں گوری ایک علامت ہے مادرِ ہند کے لئے۔ بلاشبہ یہ علامت یہ ادب کو محشر صاحب کی ایک اچھوتی دین ہے۔

فراق نے روپ کی رباعیوں میں جس دوشیزہ کی تصویر پیش کی ہے وہ یقیناً ہمارے لئے نئی تھی لیکن یہ دوشیزہ چونکہ بہار بستر و فردوس آغوش تھی۔ اس لئے اسے ہم نے ایک بازاری چیز کی طرح چھپ چھپ کر دیکھا اور میں عرض کروں گا کہ پوجا بھی۔ چوری چھپے کوئی گناہ کرنے میں جو لذت ہمیں ملتی ہے وہی لذت روپ کی رباعیاں پڑھ کر حاصل ہوتی ہے۔ جوش کی رباعیوں میں بھی جو عورت پیش کی گئی ہے وہ یا تو کہیں محض ایک تخیلی اور افسانوی عورت ہو کر رہ گئی ہے یا پھر فراق کی طرح ان کے یہاں بھی اس کی حیثیت زنِ بازاری سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔

محشر صاحب کے یہاں جو گوری ہے وہ اسی زندگی کی، اسی دھرتی پر بسنے والی، دیہات کے کھیتوں میں کام کرتی ہوئی، ایک البیلی شوخ زندہ دل گاؤں کی آزاد فضا کی پروردہ لڑکی ہے۔ فراق کے یہاں وصال کے بعد جمال کی دوشیزگی نکھرتی ہے۔ جوش کے یہاں وصال کے بعد کی بے کیفی کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ لیکن محشر صاحب کے یہاں گوری لئے اندر وہ تقدس اور معصومیت لئے ہوئے ہے جو مشرقی شرافت و تہذیب کا نمونہ ہے۔

فراق اور جوش کی ہیروئنوں میں ایک تصنع ہے، گوری میں وہ سادگی اور پرکاری ہے جو حسن کو تغافل میں جرات آزما بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گوری کی ان اداؤں کو جنہیں محشر صاحب نے الفاظ میں اسیر کر لیا ہے ہم رباعی کے چار مصرعوں میں سے جھلکتا، چھلکتا، مچلتا تڑپتا دیکھ کر تڑپ جاتے ہیں۔ ایک تصویر ملاحظہ ہو:

جائے تو قیامت سی اٹھاتی جائے
چپکی بیٹھے تو گنگناتی جائے
بادل کی گرج میں جیسے دھیرے دھیرے
جوگو، کوئی بانسری بجاتی جائے

اس قدر بلیغ تشبیہ، اس قدر ارتعاش سے بھری ہوئی تشبیہ، اس قدر نادر

تشبیہ آپ نے اور کہیں بھی دیکھی؟ تین تشبیہیں اور ملاحظہ ہوں۔

تتلی اڑتے میں رک سی جائے جیسے

آندھی چلتے میں سرو جھومے جیسے

کل صبح دہی بلوری تھی گوری

بارش کی جھر ری میں مور ناچے جیسے

محشر صاحب کا مشاہدہ اور اس مشاہدے سے پیدا ہونے والا صوتی تصور جو اس رباعی سے ظاہر ہو رہا ہے اپنے اندر وہ انفرادیت رکھتا ہے جس پر شاعر ناز کر سکتا ہے۔

اب یہ رباعی سنیئے اس میں قافیے کے استادانہ انتخاب نے کس قدر موسیقیت پیدا کر دی ہے۔

موسل دھمکے ہر ایک چوڑی کھنکے

دانوں کو سمیٹنے میں پایل جھنکے

دھانوں کی کٹائی کا ترنم، توبہ

جس طرح پکھاوج پہ مجیرا چھنکے

دھمکے، کھنکے، جھنکے، چھنکے ہیں پکھاوج اور مجیرے کے بول منہ سے بولتے نظر آرہے ہیں۔ محشر صاحب نے التزام یہ کیا ہے کہ ان چاروں مصرعوں میں ہندی کے مخلوط الفاظ کھ، چھ، جھ، سے بننے والے لفظ استعمال کیے ہیں۔ کھنکے، چھنکے اور جھنکے کے الفاظ میں کھ، چھ، جھ کی آوازیں مجیرے کی آوازوں کو ظاہر کرتی ہیں اور دھانوں اور پکھاوج کے الفاظ میں واقعی پکھاوج کی گمک سنائی دیتی ہے۔ اب یہ رباعی پھر سماعت فرمائیے اور محشر صاحب کو حقیقی اور دلی داد دیجئے:

موسل دھمکے ہر ایک چوڑی کھنکے

دانوں کو سمیٹنے میں پایل جھنکے

دھانوں کی کٹائی کا ترنم، توبہ

جس طرح پکھاوج پہ مجیرا چھنکے

کسی نے اہل دل کے متعلق کہا ہے،

بر آواز دو لاب مستی کنند

محشر صاحب کی روح موسیقی کے زیر و بم کو بظاہر موسیقی سے غیر متعلق

آوازوں میں کس طرح ڈھونڈ نکالتی ہے اس کا مزید ثبوت اس رباعی سے ملتا ہے!

گت باندھے ہوئے جھانج تھرکتی جائے
باہوں کی ہر اک چوڑی کھنکتی جائے
کھڑتال کے ساتھ بج رہی ہے ڈھولک
گوری بیٹھی چنے پھٹکتی جائے

ملاحظہ فرمایئے کہ اس رباعی میں کتنے الفاظ ہیں جو کھڑتال اور ڈھولک کی آوازیں پیدا کر رہے ہیں: باندھے، جھانج، تھرکتی، دھرتی، بچھ بچھ، کھڑتال، ڈھولک بیٹھی، پھٹکتی۔ جھانج پر جب چنے اچھل اچھل کر گرتے ہیں اور ان سے جو موسیقیت پیدا ہوتی ہے اس کو صرف ایک شاعر ہی محسوس کر سکتا تھا۔ الفاظ سے موسیقیت پیدا کرنا ایک بڑا نازک فن ہے شاعر کا کمال یہ ہے کہ یہ الفاظ بے ہنگم اور مصنوعی طور پر ہی ایک جگہ اکٹھے نہ کر دیئے جائیں بلکہ شعر کے لطف دائرہ میں ممد و معاون بھی ہوں۔

اس جگہ مجھے حضرت امیر خسرو کی ایک رباعی یاد آتی ہے اس میں آپ نے ستار کے بول نہایت استادی اور مہارت کے ساتھ اور لطف یہ ہے کہ بامعنی طور پر نظم فرمائے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

آں روز کہ روح پاک آدم بہ بدن | گفتند درآ، نمی شد از ترس بدن
خواندند ملائکہ بہ لحن داؤد | در تن در تن درآ درآ در تن در تن

جی چاہتا ہے کہ محشر صاحب کی اور چند رباعیوں کا اسی طرح تجزیہ کروں لیکن ایک تو بہت ہی کم وقت مجھے مضمون لکھنے کے لئے ملا دوسرے یہ بھی خیال ہے کہ اور حضرات کے مقالے بھی ابھی پڑھے جانے ہیں اس لئے گوری نامے کی چند رباعیاں بغیر تجزیے کے پیش کرتا ہوں۔

گاؤں کے زندہ دل نوجوانوں کے سامنے سے گوری کھیتوں کی بنیڈھوں پر سے سنبھل سنبھل کر بہکتے ہوئے اور بہک بہک کر سنبھلتے ہوئے گذر رہی ہے۔ اب نوجوانوں کے جذبات کی عکاسی دیکھئے:

حال اپنا اشاروں سے بتائے رہ جائے
الجھائی ہوئی نظر اٹھائے رہ جائے
گوری کبھی بنیڈھوں پہ جو گذرے تو ہر ایک
کھیتوں ہی میں کھانسے مسکائے [illegible]

اس رباعی میں رہ جانے کی ردیف نے گاؤں کے نوجوانوں کے خوابوں اور ان خوابوں کی شکستوں کی ایک تصویر کھینچ دی ہے۔

الھڑ جوانی کی ایک توبہ شکن ادا ملاحظہ فرمائیے:

پانی جو بھرے نغمہ کناں ہو جائے
بوڑھوں کی نظر نظر جواں ہو جائے
چبھ جائے جو خار لاتے لاتے گاگر
تلوے کی طرف دیکھے کماں ہو جائے

شریر و شوخ گوری کسی دوسرے کے کھیت میں چوری سے گھس گئی ہے اور غالباً اپنی گائے کے لئے گھاس اکٹھی کر رہی ہے۔ چوری کرتی جاتی ہے اور اس کے انجام سے ڈرتی بھی جاتی ہے۔ بار بار چونک پڑتی ہے، کس طرح؟ محشر صاحب سے سنیے:

ڈر ڈر کے چلے قدم بھی دھرتے چونکے
سن لے جو کسی کو بات کرتے چونکے
چوری چھپے یوں گھاس اکھاڑے گوری
ہرنی جس طرح چرتے چرتے چونکے

گاؤں میں کچی کٹیا ہے اور یہی کٹیا گوری کے لئے تاج محل ہے۔ اپنے خوابوں کے اس تاج محل کو سجانے کے لئے گوری کے پاس زیادہ سے زیادہ اور کیا ہوگا، گیرو اور پنڈول۔ گوری انہیں سے اپنی کٹیا تو سجاتی ہے۔ ان نقوش کے بارے میں محشر صاحب کی جو رائے ہے غالباً آپ سب کو اس سے اتفاق ہوگا:

آذر بھی اگر آئیں تو کیا کیا کترائیں
ہاں مانی و بہزاد بھی غش غش کر جائیں
گوری کی بنائی ہوئی کٹیا کے نقوش
دیکھیں تو الورا و اجنتا شرمائیں

مجھے یقین ہے کہ ان رباعیوں کو سن کر محشر صاحب کی رباعیوں کے بارے میں آپ کی رائے بھی وہی ہوگی جو میری تھی کہ گوری نامہ اردو میں ایک قابل قدر اور اچھوتا

اضافہ ہے۔ مجھے علم نہیں کہ محشر صاحب نے ان رباعیوں کا سلسلہ اب بھی جاری رکھا ہے یا نہیں۔ اگر جاری ہے تو سبحان اللہ اور اگر نہیں تو میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس سلسلے کو اور آگے بڑھائیں۔ اور رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے صدر شکیب صاحب اور بیدار صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ گوری نامے کی طباعت و اشاعت کا انتظام فرمائیں۔ کیا پتا دبستان رام پور کی کھوئی ہوئی عظمت گوری نامے کے طفیل ایک بار پھر حاصل ہو جائے۔

RekhtaDownload.com

دلدار نصری

محشر صاحب

کہتے ہیں گلستاں کا قیاس اس کی بہار سے ہوتا ہے۔ مقولہ کی صحت میں شبہ نہ ہو تو بھی محشر صاحب کی ذات کو جانچنے کے لئے یہ پیمانہ کچھ ٹھیک نہیں۔ اس لئے کہ اب گلستاں باقی ہے اور نہ بہار۔ خزاں کے ہاتھوں نے بے برگ و بار ایک شجر چھوڑ دیا ہے وہ بھی ایسا جس پر درخت ہونے کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ نہیں نہیں۔ اور شبہ یوں بھی حرام ہے۔ اس لئے اس سے بھی گریز کرنا پڑ رہا ہے۔ پھر بھی کچھ لکھنا تو ہے اس لئے کہ صدیق مکرم عابد رضا بیدار کا تقاضا ہے کہ محشر صاحب کے فن، فکر اور شخصیت پر مقالہ لکھو۔ اور وہ بھی چند گھنٹوں میں تمام کرو۔ فن اور فکر کو پرکھنے کے لئے 'دادکی ضرورت' اور مواد عنقا ہے نہ میرے پاس اور نہ بیدار صاحب کے پاس محشر صاحب کا کوئی مجموعہ پیش نظر نہیں شاید اب تک شائع بھی نہیں ہوا ہے۔ اس اعتبار سے محشر صاحب فارغ البال ہیں۔ جب پاس اپنے غل و غلم ہوا ورنہ ملک و مال تو زمانہ کے خلاف ہونے کو کیا ڈر لیکن غل و غلم نہ سہی، ملک و مال نہ سہی، عمر بھر کے ریاض کا کلیات نہ سہی کوئی انتخاب ہی ہوتا تو آج کے دن میرے کام آجاتا۔ اور میں فن اور فکر پر کچھ نہ کچھ تو لکھ ہی ڈالتا۔ لیکن نہ تو قدردانی رام پور کا مزاج ہے اور نہ شہرت کی خواہش رام پور کے قلم کاروں کو ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نظام رام پوری (میرے خیال سے رام پور کے عظیم ترین اور سو فیصدی رام پوری شاعر) کی زندگی میں اس کا دیوان شائع نہیں ہوا اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ یہ بھی کہ کچھ دن قبل ان کی قبر کا معاملہ بھی مشکوک سا ہو گیا تھا اور اتنا نزاعی کہ بیچارے کی ہڈیوں کی خاک کون سے مقام پر دفن ہے اس میں بھی شبہ تھا۔ جس حالات میں نظام رہے اس کیفیت میں بیشتر رام پوری شاعروں کو صحت کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔ اس میں حضرت محشر بھی ہیں۔ ہائے رام پور کے شاعر کی قسمت تو دیکھئے کہ زندگی بھر کے ریاض کے بعد ایک چھوٹا سا انتخاب بھی نہیں۔ رہی محشر صاحب کی شخصیت تو اس سے بھی میں ناآشنا سا۔

اس مجمع میں بہت سے لوگ مجھ سے زیادہ محشر صاحب کو قریب سے جانتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں محشر صاحب کی شخصیت پر میرا قلم اٹھانا بس ایسا ہی ہے جیسا سورج کے سامنے چراغ روشن کرنا۔ اگر مجھ میں یہ خود اعتمادی نہیں ہوتی کہ قلم کی گرفت میرے ہاتھ میں ہے تو یقینی طور پر میں اس امتحان سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ بہر حال سوچتا یہ ہوں کہ قلم کا حق ادا کردوں چاہے محشر صاحب کا حق باقی رہ جائے۔

محشر صاحب کو میں نے شعر پڑھتے دیکھا ہے پڑھواتے دیکھا، دوستوں اور شاگردوں کی محفلوں میں دیکھا، ادارت کی کرسی پر دیکھا۔ اس کے باوجود ان کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ بے تکلفی سے جانچنے کا وقت ہاتھ نہیں آیا۔ یوں کہوں اس خول کی صرف سطح دیکھی ہے جس میں محشر صاحب اسیر ہیں۔ اور یہ سطح اتنی صاف، اتنی ستھری اور ایسی چکنی ہے کہ بس نظریں پھسل جائیں۔ ایسا ہی ہمیشہ ہوا، آج سوچتا ہوں کہ یہ میرے مشاہدے کا نقص ہے یا محشر صاحب کی شخصیت کی گہرائی کہ تجزیۂ نفسی کی میری دعویداری ہتھیار ڈالے دے رہی ہے۔ اور محشر صاحب ایک "ان کہی کہانی" معلوم ہو رہے ہیں محشر صاحب شاعر ہیں۔ اور غالبؔ نے ایک متقی، پرہیز گار اور صاحب علم شخص کی شاعری پر کچھ ان لفظوں میں روشنی ڈالی تھی:

"وہ شاعری کیا کرے گا، معشوق کے ہاتھ کی جوتیاں نہیں کھائیں، شراب نہیں پی، قمار نہیں کھیلا اور جیل نہیں گیا۔"

محشر صاحب شاعری کے ان عناصر اربعہ سے ہرگز متعلق نہیں ہیں۔ اس کے باوجود شاعر ہیں اور خوشگو شاعر ہیں۔ رامپور کی شعری روایات کو قائم رکھنے میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ محشر صاحب کی اپنی شاعری سے زیادہ بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شاعر گر ہیں۔ ان کے شاگردوں نے بڑا نام پایا ہے خصوصیت سے رئیس رام پوری کا نام کسی عنوان فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے جو ہندوستان کے عظیم ترین مشاعروں میں صف اول کے شاعر کی حیثیت سے شریک ہوتے رہے ہیں اور جہاں جاتے ہیں وہاں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیتے ہیں۔ محشر صاحب خوش گلو نہیں اور اسی اعتبار سے وہ مشاعرے میں اتنے کامیاب نہیں ہوتے جتنا انھیں ہونا چاہئے تھا مشاعرے کے شاعر کے لئے خوش گلو ہونا اتنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر کام چلتا ہی نہیں۔ یہ گلے کا لوچ ہی تو ہے جس نے شاعرات کو بھی۔ اس "میدان کا مرد" بنا دیا ہے۔ خطرہ یہ ہو چکا

ہے کہ اس میدان میں عورت مرد کی سب سے بڑی حریف بنکر میدان میں آگئی ہے اور حالات یہی رہے تو گنے چنے مرد ہی شاعری کرتے نظر آئیں گے اور باقی شاعرات کے لئے مقام چھوڑ دیں گے اور ان مرد شاعروں کی حیثیت بھی ایسی ہی رہ جائے گی جیسے کلاسیکل موسیقی کے محض بڑے بڑے مرد فنکاروں کی ہے جن کا نام آتے ہی عوام محفل سے کھسکنا شروع کر دیتے ہیں۔ جہاں تک گلے کا تعلق ہے وہ قدرت کا ایک انعام ہے اور مشاعرے میں کامیابی اس کے بغیر ممکن نہیں لیکن گلے کی غیر موجودگی میں بھی شعر کی عظمت باقی رہتی ہے اور فن کا معراج بھی، مختر صاحب کی شاعری کو مشاعرے کی داد کی بنیاد پر پرکھا نہیں جاسکتا۔ اس کے ناپنے کے لئے وہ پیمانے مقرر کرنا ہوں گے جن سے شعر کی عظمت ناپی جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مختر صاحب کی شاعری روایتی انداز لئے ہوئے ہے۔ لیکن رام پور کے تمام تر شعرار (ایک آدھ چھوڑ دیجئے) روایتی انداز کی شاعری ہی کرتے رہے ہیں۔ نئے تجربوں کے لئے رامپور کی زمین ابھی تک تنگ ہی ہے۔

یہ ضرور ہے کہ اس میں شاد عارفی مرحوم نے مواد کے اعتبار سے ایک نیا اور منفرد رنگ پیدا کیا۔ اور ان کے شاگرد ہادی مصطفےٰ آبادی نے مواد اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے کچھ نئے تجربات کئے۔ لیکن شاد صاحب تو رخصت ہو گئے اور ہادی صاحب اب شاید برائے بیت ہی کچھ کہہ لیتے ہوں تو کہہ لیتے ہوں ورنہ انہیں سنے اور پڑھے ہوئے تو عرصہ ہو گیا۔ ہاں روایتی شاعری باقی ہے روایتی شاعری کی بھی کچھ اپنی خصوصیات ہیں۔ روایتی شاعری میں چونکا دینے والی بات کہنا بہت ہی مشکل کام ہے کیونکہ قدمار نے غزل کے لئے بہت ہی کم مضامین چھوڑے ہیں۔ یوں پیش تو قدیم مضامین کو بھی کیا جاسکتا ہے لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ انداز بیان پہلے سے بہتر ہو، زبان میں فرح ہو، بیان میں خوبی ہو شعر پہلے سے بڑھا چڑھا ہو تب ہی قدیم کے مقابلے میں جدید اپنا رنگ جما سکتا ہے۔ اس لئے روایتی شاعری میں سکہ جمانا اور اپنا مقام بنانا بہت ہی مشکل بات ہے اسی اعتبار سے دیکھا جائے تو مختر صاحب کی شاعری اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مختر صاحب نے نہ صرف خود شعر کہے ہیں بلکہ رام پور کی دنیا کو کچھ بہت اچھے خوش گو شاعر بھی دیئے ہیں۔ ان کی اصلاح، ان کی ہمت افزائی، ان کی بالغ نظری اور ان کے فن پر عبور نے بہت سے نئے شعرار کو دنیائے شعر میں وارد کیا ہے اور ان میں سے کچھ مشہور ہو چکے ہیں اور باقی سے یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ بھی شہرت کو گلے لگائیں گے۔ یہ ان

کی عظمت کی دوسری دلیل ہے۔

محشرؔ صاحب کے گلے نے جہاں ان کا ساتھ مشاعرے میں نہیں دیا وہاں ان کی فطری صلاحیت مشاعرہ پڑھوانے میں نمایاں ہو گئی۔ ہر شاعر کی خصوصیت الگ ہوتی ہے۔ اگر ان کو غلط مقام دے دیا جائے، تو سارا مشاعرہ بے کیف ہو جائے۔ اور یہ سلیقہ جتنا محشرؔ صاحب کو آتا ہے شاید اتنا کسی کو نہیں آتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ رام پور میں ہونے والے ہر بڑے مشاعرے کے سیکریٹری مقرر کئے جاتے ہیں۔ بھڑکے ہوئے مجمع کو قابو میں لانا انھیں خوب آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بہت ہی خوبصورت اور بڑی مزیدار باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اور حلقہ احباب میں بلبل کی طرح چہکتے ہیں۔ محفل چھوٹی سی ہو تو محشرؔ صاحب کی گل افشانی سننے کی چیز ہے۔ لیکن بڑے جلسوں میں ان کی یہ تاثیر دب سی جاتی ہے معلوم نہیں کیوں؟ کسی موضوع پر مسلسل اور مربوط ہم آہنگ تقریر کرتے ہوئے انھیں میں نے کبھی نہیں سنا لیکن بات جہاں چند جملوں تک محدود ہو وہاں وہ مجلس کو زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ ایک دو جملوں سے کسی شاعر کا تعارف یا مشاعرے میں ناگوار صورت حال کو سنبھالنے میں ان کا یہ مجلسی ریاض بہت ہی کارآمد ثابت ہوا ہے۔

محشرؔ صاحب رام پور کے ایک روایتی پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور یہاں بھی روایت پرستی نے اپنی بنیاد باقی رکھی ہے ان کی شخصیت میں رامپوریت کا رنگ نمایاں ہے۔ وہ صحافت کی منزل سے بھی گذرے اور سیاست کے خارزار میں بھی رواں دواں رہے لیکن ان دونوں مقامات سے وہ بس ساتھ خیریت کے گذر ہی گئے ریاستی عہد کی بات ہے جنگ کا آغاز ہوا تھا ایک طرف سیاسی بے چینی دوسری طرف شہری فارغ کو مضبوط بنانے کا خیال ریاستی حکومت کے پیش نظر تھا

——— رام پور کے چاروں طرف سیاسی ایجی ٹیشن ہو رہے تھے۔ لیکن رام پور کی فضا ساکن تھی۔ کچھ صنعتی ترقی اور کچھ جنگ کی برکت نے اس خطے میں خوشحالی پیدا کر دی تھی۔ لوگ پیسہ کمانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔ ریاست کی جاگیرشاہی حکومت کو فکر تھی کہ رام پور ہمسایہ ضلعوں کے سیاسی اثرات سے متاثر نہ ہو جائے۔ اس کے لئے ایک اخبار جاری ہوا۔ اور اس کے ہفتہ وار ضمیمہ میں محشرؔ صاحب بھی شامل ہو گئے۔ اسی طرح ان کی صحافتی زندگی کا دور شروع ہوا۔ اس کے بعد آغاز کا اجرا ہوا اور محشرؔ صاحب اس کے ایڈیٹر ہوئے۔ یہاں انھوں نے اخبار میں ایک مزاحیہ کالم

کا سلسلہ شروع کیا جس کا مستقل عنوان پس پردہ تھا پس پردہ میں محشر صاحب کی نشتر زنی اتنی مشہور ہوئی کہ جس دن یہ کالم اخبار میں نہیں ہوتا تو لوگوں کو پڑھنے میں لطف نہیں آتا۔ محشر صاحب روز کسی نہ کسی چھوٹی سی خبر کو اپنا موضوع بناتے اور پھر ہر بات سے ایک نئی پھلجھڑی چھوڑتے جاتے۔ ان تحریروں میں بعض اچھے مزاحیہ نمونے سامنے آئے اگر یہ مشق جاری رہتی تو شاید نثر کے کچھ اعلیٰ نمونے سامنے آجاتے جن کو مزاحیہ ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوتا۔ مگر محشر صاحب کو یہ صحافتی زندگی راس نہیں آئی۔ اور وہ اداریٔ قلمدان اپنے چھوٹوں کو دیکر رخصت ہو گئے اور ایسے گئے کہ پھر ادھر کا رخ نہیں کیا۔ ہاں شاعری کا سلسلہ چلتا رہا۔ وہ اب بھی جاری ہے۔

کچھ یہی حال ان کی سیاست کا بھی ہوا۔ نہ معلوم کس طرح یار لوگوں نے انھیں میونسپل بورڈ کی ممبری کے لئے کھڑا کر دیا۔ محشر صاحب حلقۂ احباب کے بلبل ہزار داستاں، بزم شعر میں استاد، مشاعرہ پڑھوانے میں ماہر لیکن یہ دنیا ہی اور تھی۔ سیاست کی دنیا، لمبے چوڑے دعوؤں کی دنیا، جھوٹ اور فریب کی دنیا، محشر صاحب نے پس پردہ میں باتوں کے طوطا مینا تو اڑائے تھے لیکن یہ لمبے چوڑے جھوٹے سچے وعدے ان کے بس کی بات نہیں تھے اس لئے ناکام ہوئے۔ تب سے یہ شغل سیاست تقلیدی صورت میں باقی ہے آنا کی خواہش نہیں رہی اور پھر منقلہ بھی ایسے ہیں کہ جس امام سے سلسلہ بیعت شروع ہوا ہے آج تک اسی کا وظیفہ پڑھ رہے ہیں ہر چوتھے یا پانچویں سال تجدید بیعت کر لیتے ہیں اور اور بس جبھی تو میں نے ان کو خالص رام پوری کہا ہے۔ رام پور کا ٹیپکل مزاج بھی ہے۔

اگرچہ اب روایت نئی پود کے ہاتھوں تار تار ہو چکی ہے محشر صاحب نے کھویا بہت کچھ ہے پایا بہت کم ہے۔ دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ جن پتھروں کو تراش خراش کر انھوں نے زیب و زینت بخشی وہی سنگ راہ بن گئے۔ مگر سب ہی تو نہیں۔ کچھ اب بھی ان کے ساتھ ہیں اور حق استادی نباہ رہے ہیں۔ غنیمت ہے کہ وضعداری کی شمع روشن ہے۔ رہ گیا ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم۔ تو یہ کہاں تک ہو۔ اور پھر یہ رونا بھی تو انھیں کی ذات تک نہیں آج کون استاد ہے جس کو یہ شکوہ نہ ہو!

محشر صاحب غم جاناں کے دور سے گزر گئے۔ شاید غم روزگار سے بھی ان کا تعلق بس یونہی سا رہ گیا ہے اب تو بس جشن کے دن ہیں۔ لہٰذ

شبیر علیخاں شکیبؔ

صابر رضا خاں صاحب محشرؔ عنایتی خلف جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب ۱۹۰۸ء میں رامپور کے ایک معزز پٹھان گھرانے میں پیدا ہوئے "عنایتی" اپنے نانا مولوی حافظ عنایت اللہ خاں صاحب کی نسبت سے استعمال کرتے ہیں جو رامپور کے ایک بزرگ عالم گذرے ہیں اور ان کے نام سے خانقاہ عنایتیہ آج بھی محلہ زیارت حلقہ والی میں موجود ہے جہاں محشر صاحب کا مکان ہے۔ اگر اتفاق سے صابر رضا خاں بجائے محشرؔ عنایتی شاعر کے اپنے بزرگوں کی تقلید میں کہیں عالم بننے کی ٹھان لیتے تو میں آج ان کا تعارف مولانا مولوی صابر رضا خاں کی حیثیت میں کراتا ہوتا۔ ایک ایسے جید اور متبحر عالم کی حیثیت سے جس کے سامنے بڑے بڑے عالموں کے چراغ گل ہوتے نظر آتے۔ شکر ہے کہ انھوں نے عالم بننے کی کوشش نہیں کی۔ ایسی صورت میں ان کی اپنی دنیا کیا ہوتی مجھے معلوم نہیں لیکن میری اپنی عقبیٰ ضرور خطرے میں پڑ جاتی۔ اور مجھے ان کی نہ وہ دوستی ملتی جو آج حاصل ہے نہ وہ لطف و کرم اور بے تکلفانہ صحبتیں جو ایک شاعر ہونے کی وجہ سے میسر ہیں۔ شعر و سخن کی مجلسیں اور دوستوں کی محفلیں عالمانہ رکھ رکھاؤ کی نذر اس باغ و بہار شخصیت کی شرکت سے محروم رہتیں۔ ان کی موجودگی میں قہقہے تبسم خفی کی صورت اختیار کر لیتے اور ہزاروں لطیفے اور چٹکلے جنھیں سنا کر وہ محفل کو زعفران زار بنا دیتے ہیں ان کے لب تک سے پہلے ہی "قال اللہ اور قال الرسول" کے ماحول میں دم توڑ دیتے رامپور کے کتنے ہی ہونہار اور ابھرتے ہوئے شاعر جو آج ان کے شاگرد ہیں ان کے فیض صحبت اور نسبت "عنایتی" سے محروم رہتے۔ خود ان کے تلامذہ کو بھی اس حقیقت سے انکار نہ ہوگا کہ ایسے نادر الکلام فن داں، ہمہ رنگ، بے تکلف اور چابکدست استاد کی اصلاح کے بغیر ان کا اتنی جلد خود اعتمادی کے ساتھ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانا اور مقامی اور غیر مقامی مشاعروں میں موجودہ ممتاز مقام حاصل کر لینا، کوئی آسان بات نہ تھی، اور ہیں

ذاتی طور پر واقف ہوں کہ ان کے تمام شاگردوں ان سے محبت ہی نہیں ان کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں اور میری نظر میں ان کا یہ فعلِ مستحسن عقبیٰ نہ سہی، ان کی دنیوی فلاح کا ضرور ضامن ہے۔

غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ محشر صاحب نے اپنے استادوں کا ہمیشہ احترام کیا۔ استاد رشید (تلمیذ محمود رامپوری) جن کا چند سال ہوئے انتقال ہوا ہے۔ محشر صاحب کے استاد تھے۔ وہ داغ اسکول کے آخری اور سچے نمائندہ تھے۔ شکل سے مومن مگر مزاج کے اعتبار سے داغ تھے۔ محشر صاحب کی طرح وہ بھی اپنے شاگردوں کو دوست سمجھتے تھے۔ اور اپنے عزیز شاگرد کا ذکر فخر آمیز مسرت کے ساتھ کرتے۔ انھیں اس بات کو دیکھ کر رشک کے بجائے خوشی ہوتی تھی کہ ان کا شاگرد خود ایک استاد ہے اور اس نے اپنی انتھک محنت اور خداداد صلاحیت کی بنا پر استاد سے آگے کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ استاد رشید کے علاوہ صفدر علی خاں (منجم)، حضرت محمود رامپوری اور نشترِ مقتدری سکندر آبادی سے بھی محشر صاحب نے کچھ غزلوں پر اصلاح لی ہے۔ محشر صاحب کو زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھنے کا بھرپور موقع ملا ہے۔ ان کی زندگی سپاٹ نہیں، پہلودار اور رنگا رنگ رہی ہے دفاتر سرکاری کی کلرکی اور پیش کاری کے زمانے میں بھی وہ اتنے ہی خوش اور مطمئن اور اپنی شاعری کی بدولت محترم رہے جتنا کہ ترک ملازمت کے بعد روزنامہ آغاز اور ناظم کی ادارات کے فرائض انجام دیتے وقت۔ وہ جس آسانی سے شعر کہہ سکتے ہیں اسی بے تکلفی سے عمدہ اداریہ بھی لکھ لکھ سکتے ہیں۔ سنجیدہ نثر نگاری کے علاوہ وہ بہترین مزاحیہ نگار ثابت ہوتے آغاز اور ناظم میں انھوں نے برسوں روزانہ "پس پردہ" کے عنوان سے طنز و مزاح سے بھرپور جو کالم لکھے ہیں ان کے چٹخاروں سے بہت سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔

انھوں نے مزے کے ساتھ میونسپلٹی کی ممبری کے الیکشن لڑے۔ ہارے بھی جیتے بھی۔ ہنسی ان کی زندگی ہے۔ جس طرح وہ دوسروں پر ہنستے ہیں خود پر بھی اسی طرح ہنس سکتے ہیں۔ الیکشن کے مختلف مدارج، ووٹروں کا طرز عمل، ممبری کی کامیابی اور ناکامی سے دوچار ہونے پر اس کی ذہنی کیفیات پر انھوں نے محض تفننِ طبع کے طور مزاحیہ انداز میں بے شمار قطعات اور رباعیات نظم کر ڈالیں۔ اور ان وقتی موضوعات کو ادبی شکل عطا کر دی۔

غزل ان کی محبوب صنف ہے، بہت کچھ کہا اور بہت خوب کہا۔ ہر رنگ، اور ہر انداز میں کہنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن اس ہمہ رنگی کے باوجود ان بخصوص

رنگ ہے ایک خاص لہجہ ہے جو دور سے پہچانا جاسکتا ہے۔ فکر و فن کا حسین امتزاج، الفاظ کی ذرا سی الٹ پھیر، صنعت تضاد کے صحیح استعمال اور حسن تکرار سے یہ دلکش طلسم تیار ہوا ہے۔ ایسا ایک دن، ایک مہینہ یا ایک سال میں نہیں ہوگیا۔ یہ جگنوؤں کے ریاض اور کاوش کا نتیجہ ہے ان کے یہاں آپ کو ممکن ہے جذبے کی وہ شدت نظر نہ آئے جسے غالب نے " تندئ صہبا " سے تعبیر کیا ہے جس سے " آبگینے " کے پگھل جانے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ " عجز اظہار " کے بجائے آپ ان کو ہر قدم پر قادر الکلام پائیں گے۔ ان کی شاعری عالم ہوش کی شاعری ہے۔ وہ میر سے زیادہ سودا کے قریب ہیں، سودا کی ترقی یافتہ شکل! ان کی قادر الکلامی بیک وقت تلوار بھی ہے اور سپر بھی۔ مثالاً چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آپ کو دیکھتے رہنے سے سکون ملتا ہے
آپ کو دیکھتے رہنا مگر امکاں میں نہیں

موت ہاں موت تو آساں ہے مگر مشکل ہے
زندگی جس کا سلیقہ ابھی انساں میں نہیں

ارادتاً تو انہیں ایک بار دیکھا تھا
وہ بار بار نظر آئے خود ہی یہ کیا تھا

یہ بھی خیال ہے کہ زمانہ نہ کچھ کہے
پھر یہ بھی سوچتا ہوں زمانے سے کیا مجھے

گلستاں میں نہ جانے کتنے تنکے جا بجا ہوں گے
مگر وہ چند تنکے نام جن کا آشیانہ تھا

الزام ان پہ یہ ہے کہ پیہم ستم کئے
احسان ان کا یہ ہے کہ جینا سکھا دیا

بے چین ہے دل، اچاٹ ہے دل
بستی بس کر اجڑ گئی ہے

یہ انداز مزیدار ہے، پسندیدہ ہے، لیکن اس کی تقلید خطرے سے خالی نہیں۔ بالخصوص ان کے اپنے شاگردوں کے حق میں۔ یہی سبب ہے کہ ابتدا میں ناواقف حال لوگوں کو ان کے بیشتر شاگردوں کے کلام پر " عنایتی " ہونے کا گمان گزرا۔ گویہ تاثر دیر پا

ثابت نہ ہوسکا۔ واحد القادری، رئیس رامپوری، نازش نیازی جعفر نظر، خورشید منظر اور اظہر عنایتی وغیرہ آج کے کامیاب غزل گو شاعر ہیں اور ان کے کلام میں استاد کی مخصوص تراکیب اور انداز کے ساتھ خود ان کا اپنا انفرادی لہجہ بھی نمایاں نظر آنے لگا ہے۔

محشر صاحب نظم ضرورتاً لکھتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں عوام کے عزم و حوصلہ کو بیدار کرنے کی غرض سے حکومت کی طرف سے متعدد جلسے اور مشاعرے منعقد ہوئے اور کتابچے شائع کئے گئے۔ محشر صاحب نے حکومت کی ایما پر اس طرف توجہ فرمائی اور بہت سی کامیاب نظمیں کہہ ڈالیں۔ اسی طرح ہر الیکشن کے موقع پر اپنے مرشدِ سیاسی اسلم خاں کی شان کو ملحوظ رکھتے ہوئے غضب کی انقلابی اور جوشیلی نظمیں کہی ہیں۔ اور ان نظموں کی روانی، ادبیت اور تاثیر کے پیش نظر یہ طے کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ وہ غزل بہتر کہتے ہیں یا نظم!

ناظم کی ادارت کے سلسلے میں ان پر حکومت کی طرف سے مقدمہ زیر دفعہ ۱۲۴ (الف) چلا اور قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہوئے۔

ایک دوسرا دلچسپ واقعہ جو ان کی زندگی کیلئے قطعاً غیر دلچسپ بلکہ مہلک تھا لیکن جسے انھوں نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی، ان کا ایک مقدمۂ قتل میں ملزم ہونا تھا۔ وہ وکالت خانہ میں اُسی اطمینان اور سکون سے آکر بیٹھتے۔ لطیفے سناتے اور شعر و شاعری کرتے۔ خود ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے۔ وہ بے قصور ضرور تھے۔ لیکن جب خود کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے وہ وکیلوں کو اس لڑائی کا حال سناتے جس میں بندوق اور آلۂ دھار دار استعمال ہو رہے ہوں اور وہ ایک نازک چھڑی ہاتھ میں لئے ہوئے فریقین کا بیچ بچاؤ کر رہے ہوں اور اس امن پسندی کے نتیجے میں قاتلوں کے زمرے میں شامل کئے گئے ہوں تو کون تھا جو نہ ہنستا ہو۔ اور وہ ایک دن باعزت طور پر بری ہوگئے۔

اور جب ایڈیٹری اور میونسپل کمشنری چھوڑ کر محشر صاحب نے دیہات میں کاشت کاری شروع کی تو دوست احباب نے خاصی تفریح لی۔ لیکن جس طرح وہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں "قادر الکاشت" فارمر بھی ثابت ہوئے۔ اس غیر شاعرانہ ماحول میں انھوں نے کسی دیہاتی گوری کو ماڈل قرار دے کر روپ کے رنگ میں سیکڑوں رباعیاں کہہ دیں۔ گوری کا سراپا گوری کی روزمرہ زندگی کے مختلف پہلو، گوری کے جذبات اور مختلف ذہنی کیفیات کے نقشے۔ فراق کے روپ کا جواب ہی نہیں بلکہ ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

میں نے ان رباعیات کے مجموعہ کا نام "گوری نامہ" تجویز کیا اور غالباً محشر صاحب کے

مجوزہ" دیہات رس" سے زیادہ عام فہم ہے۔ دو رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

آندھی میں لرزتی ہوئی بیلیں جیسے ہمجولیں پانوں تکتی کھیلیں جیسے
وہ دور مجھے دیکھ کے گوری بھاگی ہرنی ڈر کر بھرے کلیلیں جیسے

تتلی اڑتے میں رک سی جائے جیسے آندھی چلتے میں سرو جھومے جیسے
کل صبح دہی یاد رہی تھی گوری بارش کی جھڑ میں مور ناچے جیسے

اور جب قادر الکلامی کا ہی ذکر ہے تو میں آپ کی اطلاع کے لئے سرگوشی کے انداز میں اتنا عرض کر دوں کہ محشر صاحب کسی گھر بند نہیں ہیں۔ مزاحیہ اور ظریفانہ کلام قومی تخلص سے اچھی خاصی تعداد میں ہے۔ لیکن شکر ہے کہ انھوں نے اس رنگ کو محض تجربہ ہی کی حد تک رکھا۔ مستقل فن نہ ٹھہرایا۔ ورنہ وہ ظریف لکھنوی اور رفیع احمد خاں مرحوم سے کسی طرح کم صلاحیت نہیں رکھتے۔

محشر صاحب وسیع تعلقات کے باوجود دوستوں کے مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں اور بلا کے وضعدار انسان ہیں۔ گویہ وضعداری اس کاروباری دنیا میں مفقود ہوتی جارہی ہے۔ ۱۹۳۳ء میں میں نے انھیں پہلی مرتبہ امجد علی خاں سابق سپرنٹنڈنٹ پولس کے مکان پر منعقد ہونے والے ایک طرحی مشاعرہ میں سیکرٹری مشاعرہ کے فرائض انجام دیتے ہوئے دیکھا تھا اور مجھے یہ کہہ کر وہ ابھی خوش اسلوبی اور ذوق و شوق سے یہ فرائض انجام دیتے چلے آرہے ہیں۔ مشاعرہ پڑھوانا بھی ایک فن ہے اور وہ اس فن میں ماہر ہیں۔

یہ رامپور کی دو سو برس کی ادبی روایت ہے۔ نیکی کر کنویں میں ڈال۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو محشر صاحب کا پچاس سال کی مدت میں لکھا ہوا کلام اب تک محروم طباعت نہ رہتا۔ نہ یہ کتابی صورت میں ہے نہ رسائل کے فائلوں میں۔ جب کہ خود ان ہی کے ایک حمایہ شاگرد کا کلام پنجسالہ "کبری، صغری اور وسطی کے انداز پر تین تین مجموعوں کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ لیکن نہ زمانہ نہ ہم کو مفخم کرسکا نہ محشر کو فراموش کر سکتا ہے۔ اور آج ہم سب "جشن محشر" منا کر انھیں خراج عقیدت ہی پیش نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ ایک طرح سے اس بستی کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی طرف سے قدیم غفلت اور بے حسی کی روایات کے خلاف اعلان بغاوت بھی ہے!

محمد عبدالسلام خاں

محشرؔ رامپوری اور ان کی غزل پر تقریظ

میرے لئے محشرؔ صاحب نئے نہیں۔ میں اُنھیں اسی وقت سے جانتا ہوں جبکہ میں اپنے والدین، بھائی بہنوں اور قریب ترین خاندان کے علاوہ کسی کو نہیں جانتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ محشرؔ صاحب کے گھرانے سے میرے بڑوں کے نہایت قریبی اور گہرے روابط تھے۔ خاص طور سے میرے استاذ مربی اور بڑے بھائی محترمی مولانا عبدالوہاب خاں صاحب رامپوری مدّ اللہ حیاتہ و متعنا بطول بقاہ سے اور محشرؔ صاحب کے ماموں محترمی حافظ احسان اللہ خاں صاحب سے نہایت مخلصانہ تعلقات تھے جو بحمد اللہ اب تک بحالہ قائم ہیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ محشرؔ صاحب ہمارے یہاں بھائی صاحب قبلہ سے پڑھنے آیا کرتے تھے اُن کے درس کے سلسلے سے عربی صرف کی بالکل ابتدائی کتاب "میزان الصرف" کی ایک تعلیل کہ "گُزت" اصلاً "گوُزت" تھا، آج تک یاد ہے۔ میں نے اس وقت اِس کا کیا مطلب سمجھا تھا، آج بھی دلچسپ لطیفہ ثابت ہوگا۔ یہ غالباً ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے کہ میں نے خود میزان الصرف پڑھنی شروع کی اور یہی موقع سامنے آیا۔ محشرؔ صاحب کے "گُزت" "دُکت" اور "گوُزت" کے اصل مطلب کو سمجھا اور اپنی پرانی سمجھ پر بے اختیار ہنسی آگئی۔۔

ہاں تو اپنے اسی عہد میں ان کو میں نے جانا۔ وہ کبھی کبھی تو غالباً سزا کے طور پر دن بھر ہمارے گھر رہتے اور تیسرے پہر سے شام تک تو ان کے روزانہ کے اوقاتِ درس یا حفظ تھے ہی۔ یہ تعلق عمروں کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ آج بھی جب کہ ہماری زندگی کے رستے الگ الگ ہیں اور کشمکشِ حیات اور بُعدِ ذوق نے ایک دوسرے کو اتنا دور کر دیا ہے کہ بجز خصوصی موقعوں کے ملاقات کا اتفاق بھی کم ہی ہوتا ہے، مجھے یہ نہیں محسوس ہوتا کہ محشرؔ صاحب میرے لئے اپنے پرانے "صابر رضا بھائی" سے کچھ بھی مختلف،

ہو گئے ہیں۔ ۵۰،۵۵ سال گذر گئے لیکن ہم دونوں اسی موقف سے ایکدوسرے سے وابستہ ہیں۔ وہی چھوٹا بڑا پن، وہی لحاظ اور شفقت اور شاید ایک دوسرے پر بھروسا اور اعتماد بھی وہی پرانا۔ اگر میں ان سے آج تک دوست کی حد تک بے تکلف نہیں ہو سکا تو اس میں مخشر صاحب کی اپنی وضعداری کو بھی بڑا دخل ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ بڑے بھائی کی حیثیت ہی میں پیش کیا اور کبھی ایسا موقع نہ آنے دیا کہ خود میں ہی ان حدبندیوں کو پار کر لینے کی توفیق پاتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ یہ حد بندی یک طرفہ نہیں ہے۔ میں خود کافی قدامت پسند ہوں لیکن مخشر صاحب کے کردار کا بھی یہ خاص پہلو ہے۔ میں نے دیکھا ہے اور بڑے تعجب سے محسوس کیا ہے کہ پرانا رکھ رکھاؤ ان کی فطرت کا جزو ہے حالات کے دباؤ، واقعات کے بہاؤ کتنا ہی انھیں مجبور کر دیں تاہم ان کی یہ فطرت ابھری آتی ہے۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ مخشر بھائی صاحب قبلہ کی موجودگی میں ان کی اس بالغ و کامل شخصیت کا وہ غلاف جو نصف صدی کے تلخ و شیریں تجربوں نے ان پر چڑھا دیا ہے دفعۃً اتر جاتا ہے اس وقت مخشر صاحب ہمارے آپ کے جانے بوجھے "مخشر صاحب" نہیں رہتے۔ یقین کیجئے کہ وہ سچ مچ ۵۰،۵۵ سال پہلے کے فقط "صابر" رہ جاتے ہیں۔ ان کی ذہنی تربیت تیر و نشتر سے مسلح، تجربات، حالات اور میلانات کی ساختہ پرداختہ، نتیجہ کار شخصیت جس سے میں اور آپ سب واقف ہیں، ساری کی ساری تحلیل ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج کے نوجوان اس کو عجیب سمجھیں لیکن میں اور مخشر صاحب جس عہد کی پیداوار ہیں اس میں یہ انداز شرفا کا مزاج اور شرافت کا معیار تھا۔

محض بذلہ سنجی، مزاح اور طنز ہی مخشر صاحب کی شخصیت نہیں ہے، سنجیدگی، متانت اور خودداری بھی ان کی عملی زندگی کے نمایاں رخ ہیں۔ وہ زندگی کی کشمکشوں سے الگ تھلگ رہنے کے قائل نہیں۔ ایک عملی شخص کی طرح انھیں ساز کرنا بھی آتا ہے اور ستیز بھی۔ ان کا حال ان کے اپنے ماضی کا زائیدہ ہے۔ وہ بزم حیات میں منت دربان کے سہارے نہیں پہنچے ہیں۔ انھیں رستہ نکالنا اور اس پر گامزن ہونا دونوں آتے ہیں۔ وہ فیصلہ کرتے ہیں اور پیشقدمی کیلئے انتظار نہیں کرتے۔ ان کے رستے میں جو بھی موانع آئیں

وہ انہیں سلیقے سے دور کرنا بھی جانتے ہیں۔ وہ خود بھی خوش باش ہیں اور دوستوں کو خوش رکھنا بھی انہیں آتا ہے۔ خوش سلیقگی، انتظام اور متضاد بلکہ متصادم عناصر کو جمع کر لینا توان کا حصّہ ہے لیکن اگر وہ بپھر جائیں تو انھیں رام کرنا آسان نہیں۔ ان کی شخصیت اگر اضداد کا نہیں تو ناموافق اجزا کا بہت دلچسپ مجموعہ ہے۔

جہاں تک محشر صاحب کے فن کا تعلق ہے، ہم سب ابھی ابھی اُس سے حظ اندوز ہو چکے ہیں اور ہوتے رہے ہیں۔ یوں تو "مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید" تاہم اہل نظر نے جو تقریظیں اور تبصرے کئے ہیں اُن سے ان کی فن کاری کی قیمت معلوم ہو چکی ہے اور محاسنِ فن اجاگر ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے سنا ہے قصیدے مستزاد اور مراثی کو چھوڑ کر محشر صاحب نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ طنز مزاح بلکہ ہزل تک فکرِ رسا کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ اور سب میں استادانہ شان کو برقرار رکھا ہے

ہزل کی جب بات آ ہی گئی ہے تو یہ بھی کہتا چلوں، بشرطیکہ محشر صاحب محسوس نہ کریں، کہ ہزل ان کا خاص میدان ہے جہاں وہ طرار سے بھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی ہزل میں مزاح، مضحکہ اور زہریلا طنز سب ہی کچھ ہے اور بڑی روانی کے ساتھ۔

شعر و ادب میرا مذاق نہیں اس لئے ان سب اصنافِ سخن پر یا ان میں سے کسی ایک پر جو محشر صاحب کی جگر کاوی کا میدان ہیں، معروضی انداز میں تبصرہ کرنا نہ میرا ذوق ہے نہ کسب۔ تاہم پسند اور ناپسند ہر شخص کی اپنی داخلی کیفیت ہے جس کے لئے وجدانی یا کسی فن کے حدود جاننا یا فن پاروں میں مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھنا اور ان کی خصوصیات کا تجزیہ کر کے کسی کو ترجیح دینا ضروری نہیں اس لئے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ مجھے اردو اصنافِ سخن میں آج کی سب سے مبغوض و مطعون اور سب سے سخت جان صنف، غزل پسند ہے اور غالباً محشر صاحب کی بھی عزیز ترین متاعِ شعر یہی ہے اسی پر انھوں نے اپنی مشق کا آغاز کیا ہے، اسی پر اساتذۂ سخن سے اصلاحیں لی ہیں اور شاید اسی میں انھوں نے استادی کا درجہ حاصل کیا ہے۔ چنانچہ میں بھی ان کی غزل سرائی سے حظ اندوزی کرتا رہا ہوں۔ اقرار اگر اس خاص موقع پر نقادوں اور اہلِ ذوق کے سامنے بھی کروں تو شاید گراں اور تعجب انگیز نہ سمجھا جائے گا ورنہ اس سے زیادہ کا مطالبہ کیا جائے گا جو میری

ذاتی پسند و ناپسند کی حدود سے آگے ہو۔

اردو غزل اپنی اصل کے لحاظ سے فارسی کی دین ہے۔ یہ اردو میں منتقل ہوئی تو اپنی ارتقاء کے بہت سے مرحلے طے کر چکی تھی انداز و پرداز مقرر ہو چکے تھے۔ ابتدا تو عشق مجازی کے راز و نیاز اور محبوب سے شکوے شکایات بیان کرنے کے لئے ہوئی تھی لیکن رفتہ رفتہ اس کے موضوعات میں تنوع پیدا ہوتا چلا گیا۔ صوفیاء نے اس کو اپنے واردات کا ترجمان بنایا تو عاشقانہ عجز و نیاز اور معشوقانہ عجز و ناز کے معنی ہی بدل گئے اور فراق و وصال کی دنیا ہی دوسری ہو گئی۔ اب یہ صوفیانہ حال و قال کی بھی زبان بن گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اخلاق و موعظت، فلسفہ و حکمت، مشاہدات فطرت، عام تجربات حیات اور دوسرے بہت سے نئے موضوع غزل کی حدود میں شامل ہو گئے۔ اب غزل پوری زندگی پر محیط اور اس کا مکمل آئینہ بن چکی تھی لیکن بے کیف اسلوب ادا، سپاٹ انداز بیان اور بے اثر واقعیت ہمیشہ غزل کے عیب ہی سمجھے گئے اور ان سے بچنا غزل گو شعرا کے لئے فرض عین مانا گیا۔

"چشمانِ تو زیر ابرو انند

دندانِ تو جملہ در دہانند"

کو کسی نے غزل کا شعر نہیں کہا۔ اخلاق و موعظت، فلسفہ و حکمت، واقعیت اور حکایت میں بھی نئے نئے اور دلکش پیرایۂ بیان اختیار کئے گئے۔ استعارے، رمز، کنائے اور نادر تشبیہوں اور دل آویز تمثیلوں سے کلام میں حسن و لطافت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ جدت ادا سے پامال مضامین کو بھی کرسی نشین کر دکھایا۔ ندرت خیال سے شعر میں جاذبیت کا اضافہ کیا۔ بات سے بات نکال کر گویا ہوا میں گرہیں لگائیں، تمناؤں، توقعوں، وسوسوں اور خطروں کو تبلیغ، غلو اور اغراق کے پیرایوں میں ادا کیا گیا۔ جذبات نگاری اور تاثرات و احساسات کی عکاسی میں بھی حسن ابلاغ، سلاست بیان اور زینت و روانی کو غزل کے پیکر محض سے کچھ زیادہ ہی خیال کیا گیا۔ تاثیر و قبول شعر کا جوہر سمجھے گئے۔

کچھ اسی طرح کے فارسی غزل کے نمونے تھے جس پر کم مایہ اور روزمرہ کی بولی: اردو کی غزل کی بنیاد رکھی گئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ زمین آسمان بنتی چلی گئی۔ اردو غزل کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس کو سب سے پہلے میر۔۔۔ وہ بہتر نشتروں والے ہی سہی۔ پھر غالب

اور سب سے آخر میں اقبال جیسے بلند بالا بھاری بھرکم غزل گو میسر آگئے اور اُردو غزل کا خود اپنا سکہ رواں ہو گیا۔ وہ فارسی سے اگر آگے نہیں بڑھ سکی تو پیچھے بھی نہیں رہی۔ صورت، معنی، پرواز، پرداز اور موضوعات کی کثرت بلکہ اب تو شاید حجم میں بھی وہ متاع گراں مایہ کا درجہ رکھتی ہے۔ تاہم بنیادی خصوصیات اور ردّ و قبول کے معیار جو فارسی نے مقرر کئے تھے اُردو کے لئے بھی اپنا لئے گئے۔

داخلیت، آمد اور آورد، صحتِ لفظ اور لطفِ معنیٰ وغیرہ کے اہتمام نے الگ الگ مدرسے پیدا کئے۔ ان دونوں مدرسوں کا رامپور میں امتزاج ہوا۔ آخر میں داغ و امیر کی صحبتیں گرم ہوئیں، ایک نے دوسرے کی استادانہ تحسین و آفریں سے قدر شناسی کی۔ تاثیر و تاثر نے کم و بیش دونوں روحوں کو رامپور میں جمع ہی کر دیا تھا اب رنگ اور چوکھا ہو گیا۔ یہی مزج اور ہم روح ، آمد و رفت کے وافر وسائل، مواصلات کی وسیع سہولت، مواقع ملاقات، وسماع کی کثرت، نشر و اشاعت کی بہتات اور سامعین و قارئین کی پسند و ناپسند سے ہندوستان گیر بنتی چلی گئی۔ دلی اور لکھنؤ کے مدرسے اُردو شاعری کی تاریخ کے ابواب تو بن گئے لیکن ان کی انفرادیت کے عمل دخل کا دور گذر چکا بلکہ اب تو انتشار، نو خصوصیت، اور نئے نئے تجربوں کا عہد ہے۔

شعر و سخن درآمد ہونے والا مال نہیں۔ مشاہدہ و تاثر پھر بیان و ابلاغ انسانی فطرت ہے۔ نغمگی اور موسیقیت اور اس سے وابستگی کی جڑیں خود زندگی سے پھوٹتی ہیں، کمی اور بیشی خداداد ہے۔ افراد کے میلانات، اجتماع کی خصوصیات اور گرد و پیش کے فطری مناظر ان کی شکل متعین کرتے ہیں اور تہذیب کی سان پر ان کی منجھائی ہوتی ہے یہی شعر کی حقیقت ہے۔ خطۂ رامپور کی آبادکاری اور اس کے معاشرے کی تشکیل کے ساتھ ہی ساتھ شعر و سخن کی ابتدا، اصلاً نہ دلی کی دین ہے نہ لکھنؤ کی یہ براہ راست فطرت کا عطیہ ہے۔ اس وقت کا ہندستانی معاشرہ اس کا ڈول پہلے ہی مقرر کر چکا تھا۔ اساتذۂ شعر نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق حک و اصلاح کی اور یہ جوہر نکھر تا گیا۔ اس میں روہیلا یا پٹھان فطرت کے کچھ خصوصی اجزا بھی ہیں ۹ ہوں گے، مجھے نہ معلوم نہ ان کو تلاش کرنا میرا مذاق۔ شدتِ جذبہ بہر حال افغان خصوصیت ہے۔

رامپور اسکول کا نام میں نے بڑوں سے بھی سنا ہے اور ساتھیوں سے بھی۔ میرے بعض دوست رامپوری شعرا کے کلام کا تجزیہ وتقابل کرکے اس کی خصوصیات کو نمایاں کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں، معلوم نہیں وہ اب کس مرحلے میں ہے، خدا انہیں ان کی مساعی میں کامیاب کرے۔ اس وقت تو میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس نام کی کوئی واقعی متعین اور شخصی شے ہے تو محشر صاحب کو کم از کم اس دور میں اس کا ایک اہم نمائندہ ہونا چاہیئے۔ وہ بدو واسطہ داغ کے شاگرد ہیں جو دونوں رامپور کے روہیلا خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ خود محشر صاحب بھی پٹھان خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔ وہ یہاں کے اجتماع ومعاشرہ، رسوم ورواج، تاریخ وروایات، زبان ومحاورہ اور انداز وپرداخت سے اچھی طرح واقف ہیں اور یہیں کی آغوشِ سخن کے پروردہ ہیں۔ معاتبات میں جو گلے شکوے کا ایک انداز ہے، لب ولہجہ کا الھڑپن، بے باکانہ پرواز، غرور استغنا کا مظاہرہ ہماری شاعری کا بہت قدیم ورثہ ہے اور اردو شاعری کا دامن بھی اس سے خالی نہیں لیکن موقع ومحل سے۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ مجھے اردو اصنافِ سخن میں غزل ہی پسند ہے۔ اس کا ہر شعر مستقل معنی کا حامل ہوتا ہے اور حسبِ مذاق دل میں اتر جاتا ہے اور قائم رہتا ہے، جی چاہے اس ایک شعر سے حظ اٹھاتے رہیے، جی چاہے تو تنوع کا مزا لیجیے اور دوسرے شعر سنے جائیے۔ اتنا اور اضافہ کر دوں کہ میں ان ہی اشعار میں زیادہ لطف لیتا ہوں جو میرے مبہم واردات واحساسات کی ترجمانی کر دیں یا گزرے لمحوں کی یادوں کو کچھ اس طرح پیش کر دیں کہ ذہنی طور پر میں کبھی کی بیتی ہوئی زندگی کی طرف پلٹ جاؤں، شاعر کے احساسات کو بطور خود محسوس کر لوں اور اس کے جذبات میں شریک ہو جاؤں، چنانچہ محشر صاحب کے یہاں ایسے شعر وافی ملتے ہیں۔ ان سے جو غزل بھی سنی ہے اس میں کچھ نہ کچھ ایسے فرد نکلے ہیں جن سے میں نے لطف حاصل کیا ہے اور انہیں داد دی ہے۔

کہنے کہ محشر صاحب کی غزل میں سب کچھ ہے: زندگی کے ہر قسم کے تجربے ہیں موجودہ ماحول کی انھوں نے خوب خوب عکاسی کی ہے۔ صوفیانہ نکتے بھی ہیں اور حکیمانہ فکر

بھی۔ اخلاق و موعظت سے بھی ان کا دامنِ شاعری خالی نہیں ہے۔ خمریات کی روایتی چاشنی بھی ان کے شعروں میں مل جاتی ہے۔ غرض یہ کہ غزل کے ہر موضوع پر انھوں نے شعر کہے ہیں لیکن ان کا اصل موضوعِ سخن عشقیہ شاعری ہے۔ عشقِ حقیقی کے پھندے میں وہ نہیں پھنستے کچھ روایتی دقائق کی طرف اشارے کرتے گذر جانا الگ بات ہے۔ ان کا عشق یہی ہمارا تمہارا عشق ہے۔ اور بیشتر کلام ابتدا سے انتہا تک اسی عشق کے تمام مرحلوں کی داستان ہے، بڑی جامع اور بہت مکمل اور کہیں کہیں بڑی گہری اور بیشتر حقیقی!

محشر صاحب کی زبان صاف، بے لوچ اور حقیقت پسندانہ ہے۔ انھوں نے پرانے دستور کے مطابق اساتذہ سے باضابطہ اصلاح لی ہے، فصحا اور زبان دانوں کی نظم و نثر سے استفادہ کیا ہے اس لئے ان کے یہاں زبان کی غلطیاں بتقاضائے بشریت ہوں بھی تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ محاورات اور روزمرہ بغیر تصنع کے بندھ جائیں تو زبان میں سلاست اور روانی آجاتی ہے۔ محشر صاحب شعروسخن میں داغ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کے یہاں ایسے اشعار مل جانا تعجب انگیز نہیں۔ تاہم بزرگ جن کو زبان کے شعر کہتے تھے محشر صاحب کے یہاں ان کی وہ بہتات نہیں جو اس خاندان کے بزرگوں کی خصوصیت رہی ہے۔ محشر صاحب زبان پر مضمون کو قربان کر دینے کے قائل نہیں، نہ وہ زبان کو مضمون بنا کر مغالطے میں ڈالنا جانتے ہیں۔ پھر ہر عہد کے کچھ رواں سکے بھی ہوتے ہیں۔ محشر صاحب کا عہد نئے لفظوں اور نئی ترکیبوں کے تجربے کا عہد ہے۔

محشر صاحب کی داستانِ محبت میں شخصی تاثرات کے ساتھ ساتھ ماحول بھی نظر انداز نہیں ہونے پایا۔ محبت میں جو بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں انہیں بھی وہ بڑی خوبی سے بیان کر جاتے ہیں۔ غیروں سے اختلاط مبتلائے محبت سے اجتناب کی چوٹ کو بھی وہ محسوس کرتے ہیں۔ کامیابیوں اور ناکامیوں سے محبت میں سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ ان کا بھی انہیں احساس ہے۔ وہ ضبط و احتیاط کے تقاضے بھی جانتے ہیں اور جرأت و بے باکی کے موقعے بھی۔ انھوں نے آرزوؤں کے دیئے بھی جلائے ہیں اور شمعِ امید کو بجھایا بھی ہے۔ حسرتوں، مایوسیوں کے تماشے بھی کھینچے ہیں اور ہجر و وصل کے نقشے بھی۔ نامرادی

اور پھر لے دل جو رودادِ محبت کا انجام ہے۔ انھوں نے اس کی بھی آخری حد یں چھولی ہیں اور جیسے کہ یہ سب ان کے اپنے تجربے ہیں۔

عشق کی غیر واضح ابتدا کی کیسی حقیقی تصویر کشی کرتے ہیں، کسی کے حسن کا تذکرہ کانوں میں پڑا ہوا ہے، ہونے والا عاشق کسی موقعے پر اس کی موجودگی جان لیتا ہے اور بانقصد اس کو دیکھتا ہے لیکن پھر بار بار اور خواہ مخواہ اس کی طرف نظریں اٹھنا آخر کیوں؟

ارادۃً تو انھیں ایک بار دیکھا تھا
وہ بار بار نظر خود ہی آئے۔ یہ کیا تھا

محفلِ شراب وکباب نہ تھی، ہوئی برخاست ہوئی۔ جس کے نظارۂ حسن سے جی نہیں بھرتا تھا وہ نظارہ ختم ہوا مگر ہوش وحواس غائب، پاؤں بے سکت، نشے کا سا عالم:

یہ میں کہاں سے اٹھا ہوں شرابیوں کی طرح
نہ رقصِ دخترِ رز ہی ہوا نہ جام چلے

دل میں چور خود سے اس کا تذکرہ چھیڑیں تو سننے والے کیا کہیں گے حیا مانع، متانت حجاب، مگر تذکرے بغیر دل نہیں مانتا۔ یہ نیا غم کیسا؟

کچھ دنوں سے ایک نیا غم اور پیدا ہو گیا
چاہتا ہوں تذکرہ ان کا ہی چھیڑے جو بھی آئے

ملی اس پیکرِ حسن کی دید کا طالب اور پھر ہمہ وقت! جن خواہشوں کا پورا ہونا ممکن نہیں اگر ان کا نام حسرت ہے تو پھر یہ بھی حسرت ہی ہوئی۔ یہ خیال کتنا مایوس کن ہے:

حسرت ہے اُس کا نام جو پوری نہ ہو سکے
دیکھا کریں انہیں کو، یہ حسرت نہیں بھی ہے

عشق کو دباؤ تو اور بھڑکتا ہے۔ حیا بالائے طاق، متانت رہی نہ رہی، پاسِ وضع فرض تو نہیں مگر دنیا کیا کہے گی، یہ خیال بجا لیکن محبت میں سوچنے کا ڈھنگ ہی بدل جاتا ہے:

یہ بھی خیال ہے کہ زمانہ نہ کچھ کہے
پھر یہ بھی سوچتا ہوں، زمانے سے کیا مجھے

نگاہِ غلط انداز سے آگے کیا ہوا ہے لیکن عیش و عشرت خاک میں مل گئے۔ کھلے دماغ سے مستقبل پر غور کرنا دور کی بات ہے، جو ہو چکا اُسی کا ہوش نہیں۔ یہ استغراق کہ سود وزیاں کا احساس نہیں کیسی مؤثر تصویر ہے:

دنیائے عیش ان کی نگاہوں نے لوٹ لی
خانہ خراب دل! تجھے اس کی خبر بھی ہے

مبتلائے محبت کو کبھی کبھی گذشتہ و حال پر نظر ڈالنے کا موقع مل ہی جاتا ہے کہ آخر اس کانٹوں بھری زندگی کو چھوڑ دینے پر قابو کیوں نہیں۔ اچھا اس کی ناگواریاں کیوں نہیں کہ بھی بڑھ کر ترکِ محبت میں کچھ مفید ہوتیں۔ اس نفسیاتی کشمکش کو ملاحظہ کیجئے۔

یہ زندگیٔ عشق! اس پر اختیار کیوں نہیں
اور اختیار کچھ نہیں تو ناگوار کیوں نہیں

محبت پر زور نہیں تاہم ضبط کا دامن چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ رستے گلی میں اُن سے سرمنا ہو ہی جاتا ہے۔ کوششِ ضبط کی حدیں لب و گوش اور دست و داماں۔ دل تو دھڑکے گا، ہونٹ بھی لرزیں گے اور پاؤں بھی ڈگمگائیں گے۔ اس نفسیاتی کیفیت اور عضویاتی بے بسی کو کیسے اچھے انداز سے بیان کر دیا ہے:

کوششِ ضبطِ محبت کی قسم وہ جب ملے
دل بھی دھڑکا، ہونٹ بھی لرزے، قدم بھی ڈگمگائے

آنکھ سے آنکھ لڑی، زبان پر لاکھ قابو، محبت کے انداز کہیں چھپتے ہیں۔ عاشق کی آرزو کیا محبوب کے دل پر گذریں نہیں، اتنا تو سادہ لوح نہیں۔ چہرے پر سرخی دوڑ جاتی ہے۔ نظریں نیچی ہو جاتی ہیں۔ محشر صاحب نے جیسے خود اس منظر سے حظ اٹھایا ہے!

کسی کا رنگ وہ بدلا، وہ آنکھ شرمائی
وہ دل کی بات سمجھ لی بغیر بات کہے

یہ دفعتاً نو تنا آمنا سامنا اتفاق ہے؟ اتنی بھی سادگی نہیں۔ لجا کر کترا جانا فطری ہے تو آنکھیں چار ہوتے ہی مسکراہٹ اور ذرا آپ کو بنا کر یے دیئے رہنے کی کوشش بھی طبعی ہے۔ اس مشاہدے کو محشر صاحب نے کیا اچھا نقرہ کہا ہے!

ہنستے ہوئے کترا کے گذر جاتے ہیں مجھ سے
کیا کیا وہ مجھے دیکھ کے اتراتے ہیں مجھ سے

مبتلائے محبت کو خیال ہوتا ہے کہ محبوب نیک طینت ہے۔ ملاقات نہ دشوار ہوگی نہ اختلاط اس پر گراں ہوگا تاہم حقیقت کیا ہوگی، کون کہہ سکتا ہے مشتاق اس حسنِ ظن میں ہی مست ہیں۔ اس ظن کو بڑی اچھی طرح نمایاں کیا ہے:

ابھی ان کے کرم کی بات اپنے حسنِ ظن تک ہے
مگر امیدوارانِ کرم بہکے ہوئے سے ہیں

مبتلائے محبت کوچۂ محبوب کی طرف چلنے اور اس نا آشنا سے ملنے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ لیکن یہ احتیاط ہے کہ چہ مے گوئیاں نہ ہوں مگر کوئی پوچھ بھی سکتا ہے کہ کدھر۔ محشر صاحب نے کیسے روزمرہ میں جواب سوچا ہے!

نام کیوں لیں کسی کے کوچے کا
اک جگہ جا رہے ہیں کام سے ہم

کوچہ انجانا، کسی سے پوچھنا خلافِ مصلحت، رستہ مقرر نہیں۔ محبوب ادھر سے کبھی آتا ہے؟ کچھ دیر اسی طرف رخ، نہیں، اس کا کوچہ وہ ہے۔

اسی سوچ بچار میں کبھی پاؤں رک جاتے ہیں کبھی کسی گلی کی طرف مڑ جاتے ہیں، اس خیال کو کیسے اچھے انداز سے ادا کیا ہے:

چل کے ہر راہ پہ کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں
سوچتا ہوں یہ تیری راہ گذر ہے کہ نہیں

کوبہ کو جادہ پیمائی میں اچانک دل دھڑکنے لگتا ہے، پاؤں بہکنے لگتے ہیں اور نظریں خود بخود ادھر اُدھر پڑنے لگتی ہیں۔ اس اچانک تبدیلی سے عاشق کو خیال ہونے لگتا ہے کہ شاید کوچۂ محبوب کے قرب وجوار میں پہنچ گیا۔ ان تاثرات کو کس خوبی سے باندھا ہے:

دل میں دھڑکن، پاؤں میں لغزش، نگاہیں بیقرار
شاید آ پہنچا ہوں محشر کوئے جاناں کے قریب

مصلحت زبان کو روک سکتی ہے لیکن قدموں کی لغزش ۔ اعصابی ہیجان کھلے پکارے بتائے دیتا ہے کہ:

در جاناں ہے یہیں، کوچہ جاناں ہے یہی
میں کہوں یا نہ کہوں میرے قدم کہتے ہیں

رسمی ملاقات ہے ۔ ضبط کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے مگر اعضا کا ہیجان؛ محبوب کا اپنے جذبِ نظر سے واقف ہونا اور پھر ملاقات: دل دھڑکنے لگتے ہیں مسکراہٹوں سے استقبال شیوۂ تہذیب ہے بناوٹ ہی کیوں نہ ہو:

وہ ملاقات کا عالم کہ دھڑکتے ہوئے دل
اور ہونٹوں پہ تبسم کی نمائش رسماً

مبتلائے محبت کو اس پیکرِ وقار کے سامنے خلوت نصیب ہو اور عرض مدعا نہ کرے ۔ یہ تاثر دیکھنے کا ہے ۔ اشاروں میں کتنی باتیں کہہ دی ہیں:

طبیعتوں میں بڑا اختلاف ہوتا ہے
مجھے تو عرضِ تمنا پہ شرم سی آئی

بڑی احتیاط برتی اور بڑے لحاظ سے واقعات پیش کر دیئے لیکن اللہ رے تصنع اور تغافل کہ وہ جگ بیتی کہانی ہی سمجھے گیا:

ہر احتیاط محبت کو سامنے رکھ کر
کسی نے قصہ سنا میں نے واقعات کہے

محبوب سے ملاقاتیں ہیں ۔ ان صحبتوں کے تاثرات کیسے سنجیدہ انداز سے بیان کر جاتے ہیں:

مل سکے تو کچھ جھجک، کچھ مصلحت، کچھ احتیاط
اور بچھڑے تو نگاہوں میں لیسے دل میں سمائے

محفلِ محبوب میں محبت، صفاکیش نگاہِ غلط انداز سے محروم ہو، اغیار میں بیکی، خود سے الگ ندامت، اٹھ آنے پر غصے کو ادراک، محبت کی جذباتیت کو خندہ کہ دیدِ محبوب جیسے اور جیتی بھی ہو دیدِ محبوب ہے ۔ جذبے کے غلبے کی کیسی عکاسی کی ہے:

تری محفل سے اٹھ جاؤں یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا
جو بیٹھا ہوں تو اک توہین سی معلوم ہوتی ہے

محبوب کی غیبت میں ترکِ تعلق کا ارادہ کیا کہ عشق کی جذباتیت ابھر آئی اور شوق ملاقات تیز تر ہو گیا:

ہر بار ابھر آتے ہیں ٹھہرے ہوئے جذبات
ہر ترکِ ملاقات ہے تقریبِ ملاقات

اغیار میں سبک سری، محبوب کی قدر ناشناسی، اپنوں کا گریز، غیروں کی انگشت نمائی اور زندگی کی بربادی عشق کو سب گوارہ:

اک ہمیں دیکھئے محبت میں
کوئی بات ناگوار تو ہو

محبوب کے اشارے پر عاشقِ رسوا دلِ بیقرار کو تسکین دے بھی لے تو اس کی کیا ضمانت کہ تیرِ نیم کش صبر و قرار کو پھر چھلنی نہ کر دیگا:

اگر اپنے دلِ بیتاب کو سمجھا لیا میں نے
تو یہ کافر نگاہیں کر سکیں گی انتظام اپنا

محبوب کی سرد مہری، محبت کی ہار اور ہوس کی جیت سے مشتاقِ التفات کا دل ٹوٹ گیا۔ ماضی کی یادوں اور مستقبل کی تمناؤں کا ایک طویل سلسلہ دفعۃً رک گیا اور یاس تبسم بن کر لبوں پر نمایاں ہو گئی۔ محشر صاحب کی آنکھوں سے یہ منظر دیکھئے:

شکستہ دل سے کتنے فاصلے تمام ہو گئے
شکستہ دل کے ساتھ ساتھ ہم بھی مسکرائے ہیں

زندگی تو کسی مقصد کی طرف تپش کا نام ہے یاس مقصد ہی ختم کردے تو دل زندہ کہاں تپش کے بغیر رضائے محبوب پر راضی رہنا سانس کی آمد و شد ہے زندگی نہیں؛ بے حسی ہے، مسرت نہیں۔ اس گہری فکر کو تغزل کی سپردگی میں سنیئے:

تمہاری ہی خوشی کو اب سے سمجھوں گا خوشی اپنی
کہ جینا چاہتا ہوں ختم کر کے زندگی اپنی

جو دل شکستہ اپنے دل کے ٹکڑے جمع کرنے میں مشغول ہو اس کے سامنے گذری یاد تازہ کرنی کہ محبوب کی عام بزم میں بھی تمہیں لائق التفات نہیں سمجھا۔ ان تلخ یادوں کو اپنے بھی سامنے رکھیں اور مقصد نیک ہو تو بھی ناقابل برداشت ہے:

کسی کی بزم میں ہر ایک تھا اور میں نہ تھا، لیکن
اب ان باتوں کا رہ رہ کر مرے آگے بیاں کیوں ہو

سیکڑوں شوق، ہزاروں تمنائیں تھیں، دل شاد آباد تھا۔ ایک ایک جا رہا ہے، ویرانی سی معلوم ہو رہی ہے۔ یہ صدمہ ایسا نہیں کہ اس کی چوٹ فوراً جاتی رہے۔ "تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو" اس تاثر کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ تمثیل نے جذبے میں کتنی شدت پیدا کر دی ہے:

بے چین ہے دل اچاٹ ہے دل
بستی بس کر اجڑ گئی ہے

غم واندوہ تیز تر ہوتے چلے جائیں تو دل و دماغ تیرہ ہو کر جنون کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں اگر کہیں آرزو کی کرن رہ بھی گئی ہو تو اسے خود ہی ختم کر دینا مناسب ہے۔ کیسی واقعاتی مثال سے کام لیا ہے:

آندھیاں تیز چلیں گی تو اندھیرا ہو گا
خود بھی ایسے میں چراغوں کو بجھا لیتے ہیں

کثرتِ ناز کا مقصد معلوم، اپنا ستم بھی یاد مگر واہ رے تجاہل! آ تو رہے ہیں لیکن انجان سے۔ منظر کشی کیا خوب ہے:

فطرت ستم شناس، نظر مدعا شناس
اور آ رہے ہیں جیسے ہر اک شے سے ناشناس

کتنا وسیع پس منظر ہے۔ ماضی اور مستقبل دونوں پر پھیلا ہوا اکیا کہے۔ کیسے کہے! سوچتا ہے اور اس ستم پیشہ کی طرف دیکھ لیتا ہے پھر سوچتا ہے اور پھر دیکھ لیتا ہے۔ حالت یہی رہی تو دیوانگی میں رہ کیا گیا۔ کیا پر حسرت نظارہ ہے:

کچھ سوچنا اور ان کی طرف دیکھنا مجھے
یہ سلسلہ رہا تو جنون اب ہوا مجھے

کافر نگاہوں کے مارے ہوئے کا گلہ کتنا مختصر ؛ میری تمناؤں کا مرکز فقط نگاہ التفات ہے۔ اس پر اپنا سارا مال متاع قربان کرنے کو تیار رہوں ۔ التجا کیسی روزمرہ زبان میں ہے!

مقصود ہر امید تمہاری نگاہ ہے
تم دیکھتے رہو تو لٹاتا ہوں گھر کو میں

بھری محفل میں میری طرف دیکھنا، مسکرانا اور نظریں پھیر لینا کہ تکتے لگانے والوں کو موقع مل گیا ۔ یہ کس کی بے احتیاطی تھی ؟ محبوب کے طرز عمل کی کتنی نفسیاتی گرفت ہے پھر زبان و بیان کی روانی :

راہ ملنے لگی قیاسوں کو مسکرا کر نہ پھیرنی تھی نگاہ

عاشقِ سراپا نیاز اپنے عمل کو غیر ارادی لغزش کہہ کر داخلی و خارجی حقائق سے اس کی توثیق کرتا ہے ۔ کتنا سنجیدہ پرواز ہے :

حوصلے تو قائم ہیں، آرزو تو محکم ہے
لغزشوں پہ کیوں جاؤ، وہ تو غیر ارادی ہیں

مجھے آپ نے ٹھکرایا ۔ لیکن میرے تعلق میں کوئی فرق آیا ؟ سیدھی زبان میں حقیقت سامنے رکھ دی ہے :

یہ سوچئے کہ آپ نے ٹھکرا دیا مجھے
یہ دیکھئے کہ آپ سے نسبت وہی رہی

تنہائی میں سوچا ہے، عزتِ نفس بھی گئی، عقل پر بھی پردے پڑ گئے ۔ جان و ایمان، تو وہ آج گئے بالکل ! یہ بھرپور سپردگی، کامل ربودگی، دین و ایمان کی یہ ناقدری، جان کی یہ ارزانی ؟ اس نفسیاتی کیفیت کو کیسے روانی اور پر اثر انداز میں کہا ہے !

نقدِ جاں، دولتِ دیں، جنسِ خرد، عظمتِ دل
جانے کیا کیا ترا اندازِ نظر مانگے ہے

وہ چہرۂ سحر طراز سامنے رہا تو دل برابر دھڑکتا رہا ، نظریں اسی پر جمی رہیں ۔ غائب ہو گیا تو خیال آرہا ہے کہ کیوں ہوا ؟ :

اب سوچتا ہوں جب کہ وہ اٹھ کر چلے گئے
دل کیوں دھڑک رہا تھا، نظر کیوں جمی رہی

محبت تو دام و دانہ ہے ۔ کیسی توقعات سے آتے ہیں گر نیچے آچکنے کے بعد کتنا ہی زور لگاؤ

ربائی معلوم۔ تشبیہ کیسی اچھی ہے:

کس آرزو سے سایۂ گیسو میں آئے تھے
بیٹھے ہیں طائرانِ تہِ دام کی طرح

عاشق لغزیدہ قدم کی نظریں جھکی ہوئی ہیں۔ محبوب جوصلہ افزائی کر رہا ہے نظریں اٹھانے کی زبائش ہے۔ کتنے کیٹلے طنز سے جواب دیا ہے:

اُٹھ گئی آنکھ اگر میری، تو جم جائے گی
آپ نے دیدۂ ہرسو نگراں دیکھے ہیں

محبوب کی دلنوازی سے محبت کے بند زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ محشر صاحب آنے والے خطرے کو کیسا بھانپ لیتے ہیں:

کیوں بڑھاتے ہو محبت اتنی
چار دن بعد تباہی بھی نہ جائے

ان کے نام کے ساتھ اپنا تذکرہ انجام جو بھی ہو، عاشق کے احساسِ فخر کے لئے کافی ہے۔ اسلوب بہت سادہ ہے:

کیسے اترا رہے ہیں اپنی جگہ
ہو گئے منسوب ان کے نام سے ہم

راز و نیاز میں کیسی صاف بیانی ہے اور کتنی واقعی:

آپ کو دیکھتے رہنے سے سکون ملتا ہے
آپ کو دیکھتے رہنا مگر امکان میں نہیں

محبوب ہمہ التفات، عاشق ہمہ شوق۔ سب ہی تو کہہ دیا۔ باہر آکر ہوش آیا تو کہنے کی بات نہیں کہی۔ تحت الشعوری جھجک کا کرشمہ سنیئے:

عالمِ بے خودیِ شوق میں سب کچھ کہہ کر
بعد کو غور کیا ہے تو کہا کچھ بھی نہیں

ذہنی آمادگی کے باوجود محبوب کے جانے کے بعد سکتے کی سی کیفیت کو کیسی اچھی تشبیہ سے واضح کیا ہے:

گردشیں جیسے زمین و آسماں کی رک گئیں
بعض لمحے آپ کے جانے کے بعد ایسے بھی آئے

محبوب جفاکار کے ظلم کی کہانیاں تو عام ہیں۔ ذرا یہیں محشر صاحب سے سنیئے، کیسے حسین منظر کا نقش کی آرایش ہے۔ منظر کو جمیل بناتے ہیں کوئی نوک پلک نہیں چھوڑا ہے!

زرا زلفیں پریشان کر کے پھر انگڑائیاں لینا
زرا نیچی نگاہیں کر کے صورت دیکھنا میری

بار بار کے ہوشیار کرنے پر بھی ہوش نہیں آیا۔ وہ عمر ہی غفلت کی تھی۔ عہدِ فرد میں اس کی یادیں تو چیرکے لگاتی ہیں۔ کہنے کا پیرایہ بھی خوب ہے!

دنیا نے بار بار پکارا ہمیں تمہیں
کیا دور تھا کہ ہوش نہیں تھا ہمیں تمہیں

محبوب کے بغیر رات کاٹے نہیں کٹتی جب دیکھو کالی بلا سی کی دلیسی، کامل خاموشی۔ کاش گردشِ فلک ہی اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ محشر صاحب نے نقشہ کھینچا ہے۔ گردشِ وقت سے کیا کام لیا ہے:

وہی ظلمت، وہی ٹھہراؤ، وہی سناٹا
گردشِ وقت ہی آئی شبِ ہجراں کی طرف

محبوب سے چھوٹے دیر ہی کتنی ہوئی ہے کہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ کیا پر اثر پیرایۂ بیان ہے کہ دل پر چوٹ لگتی ہے۔ سلاست، روانی الگ رہی:

میرے اللہ! آغازِ الم انجام ہو جائے
کہ صبحِ ہجر میری زندگی کی شام ہو جائے

سامنے کے بھرپور تجربوں سے سیری نہ ہو تو ایسے شیوہ ہائے رنگیں، کرشمہ ہائے نگاریں، سادگی ہائے پرکار اور جلوہ ہائے پر بہار کا خیالی بت تراش لیا جاتا ہے جو بوستان بھر پھول اور آسمان بھر چاندنی ہوتا ہے۔ یہ عملی مطالبے کے باوجود ہمیشہ تصوری رہتا ہے ؏

اب آرزو کی حدیں وہ مقام ہے کہ جہاں
قدم کسی کے نہ پہنچیں مگر نظر پہنچے

بدلتے رہنا زندگی کی ریت ہے، بہار کے بعد خزاں، شبِ وصل کے بعد صبحِ ہجر، گر دل بہار کے ہی ساتھ ہوتا ہے اور شبِ وصل ہی پڑا رہتا ہے!

کبھی زندگی ہے چمن چمن کبھی زندگی ہے قفس قفس
کبھی میں بہار کے ساتھ ہوں کبھی دل بہار کے ساتھ ہے

؏ یہ خالص مادی تشریح محشر صاحب کے عام شعری مذاق کے موافق ہے (م۔ ع۔ س۔ خ)

RekhtaDownload.com

"عشق و ہزار بدگمانی" زندگی کا سہانا خواب۔ خوش بختی ہے مگر جوں ہی شرکت کا گمان ہو جائے تو پھر یہ اپنی خواب اپنی نہیں رہتی پرائی بن جاتی ہے۔ کیسا بھیانک گمان ہے! اور اسے دیکھے جانا کتنا سخت! مگر مجبوری! ساتھ ساتھ عمر بھر کی جلن۔ ماضی کی معصوم یادوں میں بھی رشک کی تلخی شامل ہو جاتی ہے۔ گویا عمر بھر رشک میں ہی گذری۔

رشک ہی میں گذار دی سب عمر　　　دیکھتے ہی رہے پرایا خواب۔

زندگی میں موڑ آتے رہتے ہیں اچھے اور برے دونوں۔ زندگی کا رخ بھی بدل جاتا ہے بسہولت یا بدشواری۔ مگر یہی موڑ کیوں آیا!

زندگی کے ہزار پہلو تھے　　　آپ کیوں بن گئے ادھورا خواب

عاقبت اندیشیوں کے باوجود آدمی اپنی داستانِ حیات سنانے کو کچھ مخلص تلاش کر ہی لیتا ہے' یہ بھی دغا کر جائیں تو حلقۂ اخلاص ہی بدل گیا۔

میں نے پلٹ دیا ہے محبت کے دور کو
کل کے جو رازداں تھے وہ اب رازداں نہیں

یہ ردِعمل کتنا فطری ہے اور خود ہم سب کا تجربہ مختر صاحب نے کتنا برجستہ کہہ دیا ہے:

جو آج ذکر چلا آستین کے سانپوں کا
تو مجھ کو اپنے کئی دوستوں کی یاد آئی

غم و یاس کے جیسے قافلے اتر پڑے۔ ماضی کی تابناکی پر مستقبل کی اندھیاری چھا گئی۔ ہوش پراگندہ کرب کہاں سے آ پڑے۔ برداشت کی سکت جاتی رہی۔ دل کی وسعتوں کا تنگ ہو جانا، اپنے اندر بڑی پہنائی رکھتا ہے۔ دوسرے شعر میں واقعیت کے ساتھ برجستگی بھی خوب ہے:

بساطِ دل کی وسعتیں بھی تنگ ہو کے رہ گئیں
نہ جانے غم کے قافلے کہاں کہاں سے آئے ہیں

خلافِ امید ان کے وفا کے عہد و پیماں ٹوٹ چکے، بیوفائی عاشق کے دل و دماغ پر چھائی ہے۔ وہ معذرت کرے یا پیمانِ وفا کی تجدید کرے اس کا حوصلہ کہاں عاشق ہی ذکر نکال لیتا۔ بد تو وہ 'ہاں' کر دیتا ہے مگر عاشق کو وہ 'نہیں' معلوم ہوتی ہے اس 'ہاں' کو بھی بھولے سے' کہہ کر کتنا ہلکا کر دیا ہے:

اگر بھولے سے تم ذکرِ وفا پر ہاں بھی کہتے ہو
وفورِ یاس میں مجھ کو نہیں معلوم ہوتی ہے

آستانۂ محبوب پرناکام سجدوں کا صلہ یہی کافی ہے وہ جفا ہی کرے! ایک ٹھوکر ہی لگاتا جائے۔ تغافل تو مارے ڈال رہا ہے:

دلوں کو روندتے یہ کس طرف کو چل پڑے گھر سے
ذرا ناکام سجدوں کا صلہ بھی ایک ٹھوکر سے

ضبط کی بھی حد ہوتی ہے عاشق اب اس منزل میں ہے کہ دامانِ محبوب کی طرف ہاتھ بڑھا دے بڑی برجستگی سے کہا ہے!

دامنِ ضبط چھوڑ، وہ دامن قریب ہے
اے کم نصیب، ہاتھ بڑھا، سوچتا ہے کیا

محبوب کا دامن پکڑا تو وہ چھڑا کر چل دیا انھیں چھوٹی نہیں دل کی حرکت رک جاتی تھی وہ تو نگاہیں کچھ کہہ گئیں کیسی تیوری چڑھا کر، انداز خاص میں کہا ہے!

مجھ کو ان کی نگاہوں نے سہارا دیدیا
ورنہ تم دامن چھڑانے کا نتیجہ دیکھتے

حسرت و مایوسی چہرے سے عیاں ہے۔ محبوب جفا پیشہ سے اب تعلقات کی توقع نہیں پھر بھی کتنا خیال ہے۔ محبوب کا دیکھنا کھلتا ہے!

یارب آئی تو بڑھ جائے میری مایوسی ہنس کے دیکھے وہ مجھے اور پشیماں ہو جائے

محبوب سے تعلق کا امکان جاتا رہا، آستانے پر ناصیہ فرسائی مشکل ہو جائے۔ اب غم ہجراں گسل کی آخری دوا خودکشی تھی، وہ یوں ختم ہوتی ہے۔ بیان کی برجستگی جذبے کی شدت اور واقعیت نے شعر کو بہت اونچا کر دیا ہے!

غضب تھا زہر کا ہونٹوں تک آکر یہ خیال آنا
کہیں ایسا نہ ہو، وہ فتنہ گر بدنام ہو جائے

وحشت ہی وحشت، بیاباں کی طرف قدم بڑھ رہے ہیں اور ارادہ ہے کوچۂ یار کا۔ ناکام عاشق کا یہی روایتی انجام ہے:

یہ خبر دی ہے کہ وحشت کی کرم فرمائی
پاؤں صحرا کی طرف، عزم گلستاں کی طرف

اپنی موت مانگنے کے سوا کیا چارہ ہے۔ دورِ صبح و شام سے تیزی کے ساتھ گذرنے کی التجا خوب ہے۔ وجہ اتنی اچھی بیان کی ہے کہ عاشق کی حالت زندوں کے سامنے

پھر جاتی ہے:

اے دورِ صبح و شام ذرا تیز گام چل
رکتے نہیں ہیں خانہ خرابوں کے آس پاس

عاشق ناکام کی بربادی کا غبار محبوب کے چہرے پر بھی محسوس ہونے لگا ہے۔ محشر صاحب کی تخیئل کا کرشمہ دیکھنے کا ہے:

بہارِ باغ کا منہ چومتی ہے میری بربادی
کہ پھولوں پر پڑی ہے خاک میرے آشیانے کی

مایوسی کی انتہا یہ ہے کہ عاشق اپنے بیگانے کا منہ تکے اور سینہ جذبات سے خالی ہو، خلش

اور کسک، جاتی رہے۔ یہ جنون کا ہی سخت مرحلہ ہے۔ پہلا مصرع کتنا برجستہ ہے:

دلِ مایوس کا انجام، خدا خیر کرے!
درد بھی اب سببِ زینتِ آغوش نہیں

مایوسی کے بعد کبھی سکون و طمانیت بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں آس کی ہلکی سی کرن بھی اس طمانیت کو غارت کر سکتی ہے۔ محشر صاحب نے کس ڈھنگ سے کہا ہے:

نسیمِ صبحِ تمنا! ذرا دبے قدموں
تمام رات کا جاگا ابھی ابھی نہ پڑے

تسکین ہو جائے سوچ بچار بدل جائیں لیکن حسرتیں اور ارمان تو دل کے دل میں رہتے ہیں۔ اس خیال کو کیسی کامل واقعاتی تمثیل سے واضح کیا ہے:

دل کے ساتھ ہزاروں ارماں
مفلس کی بارات ہو جیسے

عشق کے مرحلے جیسے بھی طے ہوئے ہو گئے۔ زندگی تصورات کی دنیا . . . . . . سے نکل کر حقیقی دنیا میں اور نئے عزموں کے ساتھ داخل ہو رہی ہے۔ کوچۂ جاناں پر ایک رخصتی نظر بھی:

وہ تو چلنا ہی پڑیگا غمِ دوراں کی طرف
اور کچھ دیر ذرا کوچۂ جاناں کی طرف

عشق و محبت کی منزلیں آغازِ جوانی کی کہانی تھی، جوانی کے ساتھ ساتھ ختم ہوئی۔ اب تو یادیں

ع مجھے یہ تشریح پسند ہے لیکن اصرار نہیں۔ ۱۲

RekhtaDownload.com

ہیں اگر کبھی آجاتی ہیں تو بس چل سی ڈالتی ہیں :

آغازِ جوانی و محبت کے فسانے

طوفان ہے یادوں کا کہ ٹکرائے ہے مجھ سے

بہت محدود انتخاب میں سے جو تین صفحوں سے بھی کم تھا، میں نے یہ شعر جمع کر دیئے ہیں۔ ان میں اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ، سب طرح کے اشعار ہیں۔ غالباً ان سے مختر صاحب کی طبیعت کا رنگ معلوم ہو جائے گا۔ مختر صاحب جب کبھی سادہ اور روزمرہ زبان میں کہہ دیتے ہیں اچھے اور پر تاثیر شعر نکال لاتے ہیں۔ پرانے انداز میں یوں کہئے کہ وہ 'زبان کے شعر' بہت اچھے کہتے ہیں، اور یہ ان کے خاندانِ شعر کی خصوصیت ہے۔ حزن و یاس کے مضمون اگر روزمرہ میں بندھ جائیں تو نشتر ہوتے ہیں اور بہرحال پر تاثیر ہیں۔

جس طرح میں نے مختر صاحب کے اشعار کو جمع کیا ہے بظاہر بے ترتیب معلوم ہوں گے، میں نے یہ کوشش کی ہے کہ مختر صاحب کی داستانِ محبت کو جو ان کے کلام کا اصل حصہ ہے، مرتب کر دوں۔ چنانچہ سابق کے حوالے کے لئے کچھ فقروں کے اضافے کے ساتھ لاحق شعر کو پڑھا جائے تو غالباً عشق و محبت کی ایک مرتب اور مربوط داستان سامنے آجائے گی۔ پیشِ نظر انتخاب کے محدود ہونے کی وجہ سے اس مسلسل داستان میں اگر کچھ حلقے کم ہوں تو ان کے لئے میں معذرت خواہ ہوں تاہم مرحلے سب ہی آگئے ہیں۔

کم و بیش یہی روداد ہے جو ہماری تمام غزلوں میں بکھری ہوئی ہے، اس میں جدت و ندرت تلاش کرنا بڑی حد تک ناکام کوشش ہے۔ یکساں معروض کے یکساں رخ سے یکساں زاویۂ نظر کے ساتھ بالعموم یکساں احساسات ابھرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعر نے کس طرح محسوس کیا ہے اس کا اپنا تاثر کیا ہے اور کیسے گرد و پیش میں ہے۔ تحلیل و تفصیل یا اتحاد و اجمال کتنا ہے۔ کچھ قیمتوں کو سامنے رکھا ہے یا نہیں اور ان کی اہمیت کیا ہے۔ ماحول کے اثرات کیا ہیں اور کتنے گہرے، واقعیت کتنی ہے اور شاعر کی ذاتی چھاپ کتنی۔ ادا و بیان کیسا ہے اور خاص طور سے ان سب کی تاثیری نوعیت کیا ہے، شاعر اپنے احساسات کی دنیا میں ہمیں لے جانے میں کامیاب ہوا یا نہیں۔ مقصدیت، یا احتظاظِ محض اور جمالِ خالص کی بحث جداگانہ ہے۔

مختر صاحب نے دوسرے مضامین سے بہت کم دلچسپی لی ہے۔ تاہم خال خال دوسرے موضوعات بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً آج کے انسان کی معروف زندگی کی شاعرانہ

انداز میں کیسی اچھی تصویر کشی کی ہے۔

کسے ہے کیف، نشاطِ نگاہ کی فرصت
جو وقت ہو تو یہ ذوقِ نگاہ کیا کم ہے

جد و جہد کی قدر و قیمت اور اس پر آمادہ کرنے کا انداز ملاحظہ ہو:

آگ میں کودے عزمِ انساں تو گلستاں ہو جائے   خطرہ ساحل پہ نظر آتا ہے طوفاں میں نہیں

زندگی کے تلخ انجام کو غزل کا شعر بنا کر کہتے ہیں:

دستِ گلچیں کی ہر ایک جنبش نے ثابت کر دیا   زندگی یہ ہے کہ غنچہ مسکرانے بھی نہ پائے

اہلِ دنیا کے ظاہری اخلاص کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ اس میں تجربے کی بھی چاشنی ہے:

سعیٔ حیات میں مری ضبط کی خامیاں نہیں   اس سے فریب کھاؤں گا جس کی طرف گماں نہیں

تشنۂ اقتدار اور بہبودِ عوام کا کوئی جوڑ نہیں:

وہ کیا سدھار سکے گا نظامِ میخانہ   کہ جام ہاتھ میں آئے تو ڈگمگا جائے

زندگی ابدی حقیقت ہے۔ موت (فنا؟) خود زندگی کا ہی ایک مرحلہ ہے؛ اس کو صوفیانہ تصورِ بقائی الفنا کی تعبیر بھی کہا جا سکتا ہے:

زندگی کی تو کوئی حد و نہایت ہی نہیں
زندگی ہی کی تو منزل ہے فنا ہو جانا

زندگی بے ثبات سہی مگر اس کی اصلاح کامل انقلابی تجربوں کے بغیر ممکن نہیں!

نہ جانے کتنے حوادث کے بعد سدھرے گی   وہ زندگی کہ حقیقت ہے جس کی نقش برآب،

ہر تجربہ۔ تعمیر کا پیش خیمہ ہے۔ کتنی رجائیت ہے!

پسِ حجاب خزاں مسکرا رہی ہے بہار   اٹھا رہا ہوں تصور میں بار بار حجاب،

شیخ و واعظ کے ریاکارانہ عرفان کا مضحکہ اڑایا ہے اور اس کی ذلتِ نفس و دنائتِ طبع پر جو تواضع کے پردے میں ہوتی ہے، چوٹ کی ہے:

خودشناسی کے مراتب پہ نظر ہے کہ نہیں   شیخ کعبے سے کچھ آگے بھی نظر ہے کہ نہیں

عرفانِ باری تعالیٰ کو وحدت شہود کی حیثیت میں پیش کرتے ہیں:

اک تو کہ ذرہ ذرہ تری جلوہ گاہ ہے   اک میں کہ تجھ کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں ہر کہیں

دنیا کی بیوفائی کا تذکرہ اپنے تجربوں کی روشنی میں کرتے ہیں، انداز بھی کتنا اچھا ہے۔

نام جب دنیا کا آتا ہے لرز جاتا ہوں میں
اس قدر دنیا نے ٹھکرایا ہے اے محشر، مجھے

عہدِ نو کے جبر اور نام نہاد آزادیٔ رائے کی کیسی اچھی تصویر کھینچی ہے ۔ انداز بھی اچھا ہے۔

خوشا یہ دور کہ ہر سدِّ راہِ منزل کو   سمجھ رہا ہوں ، مگر رہ نما بھی کہتا ہے

جوانی تو دیوانی ہے مگر کہولت اور عنفوانِ پیری کی سوچ بھی فریب کاریاں اور ہی انداز رکھتی ہیں :

کوئی پیری کے پیچ و خم دیکھے   نام بدنام ہے جوانی کا

خمریات کے نمونے بھی ہیں اگرچہ محشر صاحب نے کبھی شراب کا مزا نہیں چکھا ہے ۔ واعظ کی بات کیسی جلد مان لیتے ہیں :

شرابِ ناب کو واعظ حرام کہتے ہیں
حرام ہے بھی تری جنبشِ نظر کے بغیر

آج سمجھے ہیں تجھے اے جرأتِ رندانہ ہم
ورنہ تکتے تھے نگاہِ ساقیِ میخانہ ہم

خلاف توقع مقالہ طویل ہوگیا ۔ چند شعر جو محشر صاحب کے شعری مزاج کے مناسب ہیں اور پہلے کہیں پیوست نہیں ہوسکے اپنے تاثر کے بغیر پیش کئے دیتا ہوں اور بقول محشر

کلیوں کی صدا بھی سنتے جاؤ   افسانہ قریبِ ختم ہی ہے

جب چمن ہی نہیں تو کچھ بھی نہیں   خاک چھوڑوں گا آشیانے میں

جو فصلِ خزاں پہ ہنس دیئے ہیں   اُن غنچوں پہ اوس پڑ گئی ہے

نویدِ جشن مبارک مگر نسیمِ بہار!   چمن کا دل ہیں وہ غنچے جو مسکرائینگے

پہلے طوفان بھی کترا کے گذر جاتے تھے   اے مرے سلسلۂ خواب میں کیا تھا پہلے

آخر میں ایک عیدی پیش کرتا ہوں ۔ ان کی حزنیہ شاعری کی یہ بھی ایک اچھی مثال ہے۔

قطعے کے دونوں شعر اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ عید پر بہترین لباس کا انتخاب عام رسم ہے، محشر صاحب نے کیا پر تاثیر لباس انتخاب کیا ہے۔ اپنوں بیگانوں کی عید دیکھنا بھی خوب ہے۔

دھجیاں دامن کی اڑتی پھر رہی ہیں ہر طرف — کاش! تم بھی دیکھ لیتے اپنے دیوانوں کی عید
اے تغافل کیش! اک تیرے نہ ہونے کے سبب — حسرتوں سے دیکھتا ہوں اپنوں بیگانوں کی عید

---

۲۹ / ۱۲ / ۷۱ ء
تسوید ۹ / ۲ / ۷۱ ء

RekhtaDownload.com

محشر عنایتی

RekhtaDownload.com

اسلم خاں

صدر محترم اور "دوستو"

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ میں تقریر نہیں کرسکتا۔ جو شخص ہر وقت لنگوٹ کسے رہے اور اس کے بعد بھی یہ الفاظ کہے اس کے کچھ وجوہ ہونے چاہئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مختصر بحیثیت دوست، ساتھی اور ہم کفو اس قدر قریب ہے کہ دبی میری پرسنیلٹی کو بریک لگا رہا ہے:

ہم ہیں غالب کے طرفدار، سخن فہم نہیں

اور اس دعوے پر فخر کروں گا کہ یہ ذہانت مجھ میں نہ ہو! اس لئے میں ذات پر بولوں گا اور شاعری پر گریز کروں گا۔ عبدالسلام خان نے کہا کہ شاعری ان کا میدان نہیں گر میں نہ بدذوق ہوں نہ بے ذوق۔ ان کی شاعری کو جتنا پسند کرتا رہا ہوں اس کا اظہار کرتا ہوں لیکن: ذات کی بات کروں گا تو اس میں غلو نہ ہوگا۔

ایک تنقید کا اسکول یہ بھی ہے کہ جو اچھا انسان ہے وہ اچھا شاعر ہوگا۔ اس لحاظ سے اگر ذاتی خصوصیات پر معمولی سی باتیں بھی کہوں تو آپکو اندازہ ہوجائے گا۔

جب سے ہوش سنبھالا میں نے انھیں شاعر ہی پایا۔ جب میں ہائی اسکول میں تھا یہ یہاں کے نمایاں شاعروں میں تھے۔ شبیر علیخان نے کہا میں ان کا مختصر سا سیاسی مرشد ہوں۔ مگر میں نے کبھی ان سے خواہش ظاہر نہیں کی۔ لیکن اس طرح جائزہ کریں، ہم آہنگی تھی کہ بغیر مرے کہے ہمیشہ ساتھ دیا۔ یہ ان کی وضعداری اور محبت کا ثبوت ہے جب میں ۴۳ء میں (تعلیم کی تکمیل کر کے) آیا اور ۵۲ء میں مجسٹریٹ ہوا۔ یہ عرصہ اس میں کوئی کلرک

تھے۔ اس وقت سے جو پرکھا اور پایا تو مولانا آزاد کا ایک پرانا مضمون یاد آیا کہ بڑا آدمی کون ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ برطانوی سامراج میں کسی شخص پر لیبل لگ جائے بڑے آدمی کا آئی۔ سی۔ ایس وغیرہ، اور اس کی لوگ قدر کریں تو وہ کچھ نہیں، لیکن لیبل کے بغیر قدر کریں تو بات ہے۔ اور سب سے بڑا درجہ اس کا ہے کہ چپراسی ہے اور محترم ہے تو وہ سب سے زیادہ ہے۔ محشر صاحب جب محرر سرسری تھے تو بھی سکریٹری، مجسٹریٹ وغیرہ محشر صاحب کو اتنی ہی محبت، عقیدت اور احترام کے ساتھ دیکھتے تھے۔ یہ انکی انفرادیت اور شخصیت کے محترم ہونے کی دلیل ہے۔ یہاں لائبریری کے ساتھ تحصیل میں اختر خاں کے والد ممتاز بھائی تحصیلدار تھے نواب صاحب کے قریبی دوست تھے لیکن محشر کا نام اس قدر محبت عقیدت اور خود اعتمادی کے ساتھ لیتے تھے (کہ آج بھی یاد آتا ہے)

وضعداری، حفظ مراتب کا خیال! افراد کے ساتھ، جماعت کے ساتھ اخلاص، رام پور سے محبت، اچھی روایات سے محبت، ملک سے محبت، حتیٰ کہ جدیدیت سے محبت ـــــ شخصی حیثیت سے رام پور میں غالباً مجھے ایک فرد بھی نظر نہیں آتا جتنا اعتماد ان پر ہے۔ ۱۹۴۸ء سے برابر الیکشن میں، ہر سیاسی دور میں محشر صاحب شانہ بشانہ ساتھ رہے ہیں۔ اس درمیان میں میرا الیکشن بھی آیا اچھے میاں چیرمینی کے لیے کھڑے ہوئے۔ ہم نے ۳۳ میں سے ۲۲-۲۳ سیٹیں جیتیں۔ محشر صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ آج تصور بھی نہیں آتا ہے ۵۰۰ ۱ ہزار کے بغیر وہ کیسے لڑے ہوں گے۔ محشر صاحب کا اس الیکشن میں ڈیڑھ روپیہ صرف ہوا تھا، اور آخر تک اس پر بھی افسوس رہا۔

۱۹۶۲ء میں ایم پی کے لئے لڑا۔ مختلف گفتنی ناگفتنی وجوہ ہوگئے شہر رام پور نے بہت کم میرا ساتھ دیا۔ مجھے اتنے ووٹ بھی نہ ملے جتنے کبھی رکشا والے کو مل جاتے۔ امام حسین کے ساتھ ۷۲ تھے میرے ساتھ پانچ بھی نہ تھے۔ میری ضمانت ضبط ہوئی لیکن اس کا افسوس ہوا کہ شہر رامپور کے لوگوں نے جس معیار پر ووٹ کیا اس سے میرے اوپر ایسا شدید رد عمل ہوا کہ میں نے سوچا غالباً مجھے رام پور چھوڑ دینا چاہیے۔ پھر معلوم نہیں کیا الہامی نظم محشر صاحب نے کہی کہ رخ بدل گیا) اگر شاعر کا کام دلوں کو جوڑنا مرہم فراہم کرنا ہے تو میری زندگی میں شاعر کا کام کبھی اتنا اہم نہ ہوا تھا۔ اگر وہ نظم وجود

میں نہ آتی تو شاید آپ مجھے رام پور میں نہ دیکھتے۔ اور یہ نظم انھوں نے بغیر میری فرمائش کے لکھی!

محشر صاحب کی شخصیت ایسی ہے کہ اگر میں کہوں کہ میں ان کا ممنون ہوں تو شاید تعلقات ختم کر دیں۔ انھیں دوسرے کے اخلاص پر اتنا اعتماد رہتا ہے کہ پہلے خود ہی کوئی بات اس کی طرف سے طے کر لی پھر آ کر کہہ دیا! مگر کسی ایسے کام کو کبھی نہیں کہا۔ جو خلاف اصول ہو۔

ایک زمانہ میں نیاز (فتحپوری) اکثر یہاں آیا کرتے اور میرے مہمان ہوتے؛ ان کے سامنے کوئی شخص بطور شاعر میں پیش کرتا تو محشر صاحب کو۔ ان کا سرٹیفکٹ لے کر Publicity ہونا دوسری بات ہے ورنہ صحت کے ساتھ یہ پختہ کلامی ہندوستان میں کم ہی ملے گی جو محشر صاحب میں ہے۔ غریب خانے پر جوش، فراق نشور، روش وغیرہ آتے رہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس میں میرا ذاتی تبصرہ و تعارف بھی شامل ہوتا تھا لیکن اپنا ذاتی تجربہ بھی تھا، کہ جو ہر شہر میں جا کے کہتے تھے یہاں قادر الکلام حاوی شاعر ہے تو محشر۔ تو جو Intellectual جنہیں حق پہنچتا ہے وہ آج بھی مبارکباد دیتے ہیں، تحسین ناشناس کو چھوڑیئے، سکوتِ سخن شناس کبھی نہیں ہوا!

محشر صاحب پر قتل کا جو مقدمہ چلا اس میں ان کی جسارت اور بھرپور کیرکٹر ابھرا نمایاں ہے کہ سیکڑوں مقدمے فوجداری کے کرتا ہوں مگر ایسی مثال نہیں ملتی۔ شہر کے لیڈنگ خاندان کے فرد، جب جھگڑے کی اطلاع ملی تو آپ باقاعدہ اچکن پہن کے پتلی سی چھڑی لیکے محض دیکھنے کے لئے نکلے۔ حقیقی ماموں کا جھگڑا تھا۔ لیکن ان کی خاندانی روایات یہ رہیں کہ خود کبھی پہل نہ کی جائے، لیکن شورہ پشتوں سے ڈر کے بھاگا بھی نہ جائے۔ وہاں تیر، بھالے، بندوق تھے۔ مگر محشر ایک سیکنڈ بھی ذہن میں نہیں آیا کہ کسی طرف کو بھاگ جائیں اسی پتلی چھڑی ہی سے بچاتے رہے۔ پھر ان پر ۳۰۲ کا مقدمہ چلا مگر مطلق ہراساں نہ ہوئے۔

اب ان کی شاعری کے بارے میں کچھ عرض کرتا ہوں۔

جو محشر کو مسلم الثبوت اور قادر الکلام و مستند تسلیم نہ کرے وہ بے ذوق بھی ہے بدذوق بھی۔ ان کے یہاں ربودگی ہے روانی ہے سلاست ہے آمد ہے۔ ابھی کوئی مداح ان

نے تبصرہ کیا کہ ان کا کلام ابھی تک نہیں چھپا۔ ایک آدھ صاحب نے یہ بھی کہا کہ ہم لوگوں کی بھی کوتاہی ہے ان کی بھی۔ آپ نے سنا ہوگا کہ بزرگان دین مسلمانوں میں بھی ہندوؤں میں بھی، اپنے آپ کو چھپاتے تھے یہ امران کی دلی، دائمی، تسکین کا باعث ہوتا تھا۔ موسیقی سیکھنے والے موسیقی سیکھا کرتے تو ۱۵۔ ۱۵ گھنٹے ریاض کرتے تھے، اور بس اسی میں مگن رہتے تھے۔ آج کل صرف وہ فنکار کہلاتا ہے۔ جس سے آپ متعارف ہوں، جو ریڈیو میں آئے پکچر میں آئے۔ مگر کوئی گویّا اس وقت تک ریڈیو میں نہیں آسکتا جب تک اپنے ضلع کے افسران کی خوشامد نہ کرے اور پھر آگے جا کے اسٹنٹ ڈائرکٹر وغیرہ کی بھی! شہرت ضرور ہوگئی، مدّت بھی آگئی آسودگی بھی لیکن، اپنے ساتھ اخلاص نہیں لا سکی۔ اسی طرح آج کل شعر و شاعری کا معاملہ ہے، اگر مشاعرہ والوں سے آپ کی دوستی ہے اور آل انڈیا مشاعرہ والوں کے قریب ہیں تو کام چل جائے گا۔۔۔ لیکن (اس میں چکر میں) اگر آپ خود اپنی نظروں میں گرتے جائیں تو آپ کے کلام میں، کوئی بات کہاں سے آئے گی؟ محشر صاحب کی یہ بے نیازی، یہ بے فکر منشی محشر صاحب کو عظمت بخشتی ہے!

محشر صاحب مجھے اتنے ہی عزیز جتنے اپنے خاندان کے لوگ۔

اختر علی خاں بحیثیت شاعر ان میں بے پناہ صلاحیت ہے لیکن بحیثیت انسان کے بھی ان کی عظمتوں کا قائل ہوں۔ ان کے کلام کا مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا اس میں زیادہ دخل ان کی اپنی غفلت کو ہے۔ میں صاحب صدر سے اور دونوں شاگردوں سے گذارش کروں گا کہ ان کے کلام کو شائع کرایا جا سکے اس کی کوئی صورت نکالیں۔ اس سلسلے میں عوام کی طرف سے پورا پورا تعاون ملے گا۔

سیّد فریدالدین (اچھے میاں)

اس حقیقت سے انکار دشوار ہے کہ محشر صاحب ایک دلچسپ بزرگ ہیں جو ایک طرف غیر معمولی ادبی صلاحیتیں رکھاتے ہیں: میرے علم میں اتنا قوتِ ناظمہ رکھنے والا نہیں گزرا۔ اور رام پور کی یہ بد قسمتی رہی کہ میاں کے بزرگ اساتذہ اور فنکاروں کو عام طور پر روشناس کرانے کی کوشش نہیں کی گئی: شاید ایک شاد صاحب کے سوا!

دوسری بات جو میں نے ان میں پائی وہ ان کی غیر معمولی ذہانت اور حافظہ ہے۔ لطائف اس قدر کثیر یاد ہیں، اساتذہ کا کلام اور اپنا کلام اس قدر یاد ہے کہ اس کی مثال کم ملے گی۔ پھر غیر معمولی اعصاب کے آدمی ہیں، ہر قسم کی پریشانیوں میں آپ کو اس کا اظہار نہیں ہوتے رہیں گے۔ مجھ سے محشر صاحب سے اس قدر پرانی ملاقات ہے کہ جب مجھے یہ احساس بھی نہ تھا کہ شاعری کیا چیز ہے۔

قطعات

RekhtaDownload.com

رشتۂ عشق و حسن قطع ہی رکھ
بے نیازی کی شانِ خاص نہ چھوڑ
جس کو معصوم جانتا ہے کوئی
اُس نظر سے کسی کا دل تو نہ توڑ

مسکراہٹ کی آڑ لے لے کر
کھل رہی ہے چمن میں ایک کلی
کس قدر جاذب نگاہ، مگر
سوچتا ہوں اگر ہوا بھی چلی

عشق کی پڑ رہی ہیں بنیادیں
دل ہے اور شعلۂ نظر سے الگ
برق یوں کوندتی ہے رگ رگ میں
جیسے گاتا ہو کوئی دیپک راگ

شہد کی مکھی، بھونرا، دونوں مل کر آس لگائیں
کلیاں چٹکیں اپنے چمن میں پھولوں کی رُت آئے
پھولوں کی جب رُت آئے تو اسمیں کس کا دوش
پھولوں کا رس مکھی چوسے، بھونرا چکر کھائے

RekhtaDownload.com

رادھا کی بھرپور جوانی چاند کہو یا پھول
کوئی چکور نہ کوئی بھونرا، لاگ سنے تڑپے کون
رادھا کی بھرپور جوانی سونی سیج بے لاگ
پھول کھلا، جنگل میں لیکن دیکھے سونگھے کون

مسلماں اے اسیر غم مسلماں! پلٹ جا، جانب مرکز پلٹ جا
زمانہ ہے کہ آگے بڑھ رہا ہے تو تیرہ سو برس پیچھے کو ہٹ جا

کسی بنجر زمیں کا پیڑ کھل کھل فرشتوں نے کئی سو سال رہتا
نہ جب ممکن ہوا انسان بنتا تو اس ڈھولک کا رکھا نام نیتا

جیسے برسات میں بادل کے حسیں ٹکڑوں سے
قلعے بنتے ہیں، بگڑ جاتے ہیں، پھر بنتے ہیں
یوں ہی میں نے بھی خیالات کے زیر سایہ
اکثر اوقات خیالوں کے محل دیکھے ہیں

RekhtaDownload.com

یہ احتشام و اختر و انور، میرے دوست
میرے رفیق، میرے طرفدار میرے دوست
کردار کا یہ حال کہ غیروں کو شرم آئے
اقوال کی یہ شان کہ شرکار میرے دوست

زندہ باد! احباب جن کا ظاہر و باطن، پناہ
"آستیں ہیں دشنہ" لب پر درد کا دفتر کھلا
مرحبا اغیار، جن کا ظاہر و باطن تو ایک
سامنے آتے ہیں لے کر ہاتھ میں خنجر کھلا

Rekhta Download.com

رباعیات

RAMPUR RAZA LIBRARY
4.25.02
27.8.97

وہ کیف لئے اب کے سحاب آیا ہے   اک شور ہے دور مئے ناب آیا ہے
تم جام بہ کف، زلف بہ دوش آجاؤ   مے خانۂ فطرت پہ شباب آیا ہے

کب آؤ گے، اب آؤ گے، جب آؤ گے   یا ان کے قیامت کا سبب آؤ گے
آئی ہے بہار اور برستی ہے شراب   تم اب بھی نہ آؤ گے تو کب آؤ گے

وہ ان کی محبت سے بھری تحریریں   پُرشوق ملاقات کی وہ تدبیریں
ہر روز نئی وضع، نئی صورت سے   گلشن میں ملا کرتی تھیں وہ تصویریں

اب بچ کے گناہوں سے بسر کیا ہوگی   قائم ہے جوانی تو خبر کیا ہوگی
بے چین ہوں پیری کا تصور کر کے   جب شام ہے ایسی تو سحر کیا ہوگی

دنیا سے عجب تر کوئی مجلس ہی نہیں   دنیا سے زیادہ کوئی بے حس ہی نہیں
منعم کے عقیدے میں تو دنیا منعم   مفلس کی نظر میں کوئی مفلس ہی نہیں

گویائی پہ قدرت ہے کہا کرتا ہوں
دریا ہوں بہ یک رنگ بہا کرتا ہوں
کرتا ہوں برائی تو ہر اک کی سب سے
اچھائی پہ خاموش رہا کرتا ہوں

جھکتی ہے ثمر دار، یہ اک شاخِ درخت
لیکن یہ شکم سیر، یہ اہلِ زر و تخت
کچھ راہِ خدا میں ابا رے تو بچہ آیا
سرکار میں بھوکا ہوں نکل جا بدبخت

الزام ہیں صدہا تو ہزاروں بہتان
بدنام بہ ہر طور ہوا ہے شیطان
شیطان کو مردود سمجھنے والو!
شیطان تو شیطان ہے لیکن انسان

لب مصدرِ تاثیر بنا دے اللہ
دل مرکزِ تسخیر بنا دے اللہ
سلطان، نہ خاقان، نہ قیصر نہ خدیو
بندے کو فقط پیر بنا دے اللہ

بدمست شرابی مری منزل کو نہ دیکھ
کیا سمجھے گا تو میرے فضائل کو نہ دیکھ
ہاں دیکھ، یہ تسبیح، یہ داڑھی یہ عبا
دل دیکھے گا؟ لے دیکھ، مگر دل کو نہ دیکھ

سچائی پہ بنیاد اٹھائی ہوتی
اخلاص و محبت سے سجائی ہوتی
اے دوزخ و جنت کے بنانے والے
انسانوں کی دنیا بھی بنائی ہوتی

Rekhtadownload.com

ہمدم! مرے ایوانِ ترقی میں تو چل
دیکھ! آج کی دنیا کا ذرا رنگ محل
ہیں! بڑھ کے یہ کیا ڈھونڈ رہا ہے؟ ایمان
ہے کوئی؟ ادھر آؤ! نکالو پاگل

پی لوں گا کہ بیدار رہیں احساسات
پی کر غمِ دوراں سے نہ پاؤں گا نجات
ہوں رندِ خود آگاہ، نہ بدلوں گا کبھی
تلخابۂ انگور سے تلخیِ حیات

پوتا ہی تو ہوں، غم کی کہانی دے دی
میراث میں دادا کی نشانی دے دی
جنت میں وہ خوش تھے تو یہاں بھیج دیا
بچپن ہی میں خوش تھا تو جوانی دے دی

—

اک سلسلۂ دار و رسن ہے کہ وہ زلف
میری شبِ فرقت کی پھبن ہے کہ وہ زلف
حیرت زدہ دل پیچ میں ہے، سورج کی
بادل میں یہ چھنتی سی کرن ہے کہ وہ زلف

وہ ڈوب چلا مہر، ذرا بزم رچاؤ
چنگ و خم و پیمانہ و رقاصہ کو لاؤ
یہ کون ہے گستاخ؟ جو کہتا ہے نہیں
مذہب کا تصور؟ کہو محتاجوں میں جاؤ

قدرت نے مجھے عقل کی دولت دی تھی
دنیا کے مسائل میں سمجھ اچھی تھی
میں اور کسی شخص سے دھوکا، توبہ
تقدیر میں چکر تھا، محبت کی تھی

RekhtaDownload.com

کیوں صرفِ توکل پہ کہا جینے کو
کیوں منع کیا چاک جگر سینے کو
واعظ کو تو یہ خود بھی سمجھ لینا تھا
کھانے کو خدا دے گا، مگر پینے کو؟

ہر گام قدم تیز بڑھاتا تیز گذر
ماحول نے دم گھونٹ دیا تیز گذر
ناکام تمناؤں کے گھیرے سے نکل
اے قافلۂ عمر ذرا تیز گذر

RekhtaDownload.com

دیہات رس

رباعیات

RekhtaDownload.com

جاگے تو قیامت سی اُٹھائی جائے   چکّی پیسے تو گُن گناتی جائے
بادل کی گرج میں جیسے دھیرے دھیرے   جوگن کوئی بانسری بجاتی جائے

آندھی میں لرزتی ہوئی بیلیں جیسے   ہم جولیں پا نور ٹکنی کھیلیں جیسے
وہ دور مجھے دیکھ کے گوری بھاگی   ہرنی ڈر کر بھرے کلیلیں جیسے

بازو بھر کیں تو مونڈھے پھڑکیں لچکیں   شرالٹوں کے ساتھ ساتھ بانہیں لچکیں
جب سانجھ، سویرے گائے دوہے گوری   صندل کی ہوائیں جیسے شاخیں لچکیں

چُنری جو ہوا کی زد سے مڑتی جائے   مڑتی جائے دھنک سی جڑتی جائے
برسات میں یوں پینگ بڑھائے گوری   جس طرح پری فضا میں اڑتی جائے

گت باندھے ہوئے چھاج پھٹکتی جائے   بانہوں کی ہر اک چوری کھنکتی جائے
کھرتال کے ساتھ بج رہی ہے ڈھولک   گوری بیٹھی، چنے پھٹکتی جائے

اک روز ملی تو منہ چھپا کر بھاگی
اک روز ملی تو منہ دکھا کر بھاگی
گوری کو میں ناداں کہوں یا پگلی
اک روز ملی تو منہ چڑا کر بھاگی

بوسیدہ سے کپڑوں میں جوانی کا سجاؤ
الجھے ہوئے بالوں میں قیامت کا بناؤ
گوری میں تکلف نہ تصنع، لیکن
زاہد بھی جو دیکھے تو کہے مجھ کو بچاؤ

مکا جو ہلائے تو اکڑتی جائے
دھرتی بچھ بچھ کے پانو پڑتی جائے
ٹھہرے ہوئے تالاب میں پاتر جیسے
پچ پچ کے بڑھے اور سکڑتی جائے

آذر بھی اگر آئیں تو کیا کیا کر آئیں
ہاں مانی و بہزاد بھی غش غش کر جائیں
گوری کی بنائی ہوئی کٹھیا کے نقوش
دیکھیں تو الورا و اجنتا شرمائیں

موسل دھمکے ہر ایک چوڑی کھنکے
دانوں کو سمیٹنے میں پایل جھنکے
دھانوں کی کٹائی کا ترنم توبہ
جس طرح پکھاوج پہ مجیرا جھنکے

سسرال کو جائے تو لپٹ کر روئے
سسرال سے آئے تو لپٹ کر روئے
میکے سے وہ الفت ہے کہ میکے والا
صورت بھی دکھائے تو لپٹ کر روئے

حال اپنا اشاروں سے بتائے رہ جائے
للچائی ہوئی نظر اٹھائے رہ جائے
گوری کبھی مینڈھوں پہ جو گذرے تو ہر ایک
کھیتوں ہی میں کھانسے مسکرائے رہ جائے

پانی جو بھرے نغمہ کماں ہو جائے
بوڑھوں کی نظر نظر جواں ہو جائے
چبھ جائے جو خار لاتے لاتے گاگر
تلوے کی طرف دیکھے کماں ہو جائے

ڈر ڈر کے چلے، قدم بھی دھرتے چونکے
سن لے جو کسی کو بات کرتے چونکے
چوری چھپے یوں گھانس اکھاڑے گوری
ہرنی، جس طرح چرتے چرتے چونکے

بھوجن جو کبھی کھیت پہ لے کر آئے
تھریا کو اوڑھنیا سے چھپاتی جائے
روٹی، بھاجی، مگر سلیقہ دیکھو
جیسے کوئی حور منّ و سلویٰ لائے

دوشیزۂ نغمات کے گیسو چھو کے
جھونکے سے بہاروں میں چلے خوشبو کے
بھیڑوں کو چراتے ہیں وہ گاتی گوری
برسات میں جیسے کہیں کوئل کوکے

ساون میں پپیہے کی صدا ہو جیسے
طاؤس کہیں بول رہا ہو جیسے
وہ کھیت میں چڑیوں کے رکھانے کی صدا
گیتوں کا طویل سلسلہ ہو جیسے

RekhtaDownload.com

نظمیں

RekhtaDownload.com

تلوار

اے ہلالِ ارض، اے تلوار، اے برقِ جمال
میری ان آنکھوں میں ہے اب تک تری شانِ جلال

اے شبابِ رُوحِ ملت، اے عروسِ ملک و قوم
میں نے دیکھا ہے ترا اندازِ بے داریٔ نوم

اے فروغِ مملکت، اے پاسبانِ مملکت!
تیرے ہنگاموں نے توڑا ہے سکوتِ شش جہت!

اے ضیا اے ماہِ اوج، اے نورِ مہرِ ارتقا!
تو نے بدلا پستیوں کو رفعتوں سے بارہا

اے ربابِ زندگی، اے نغمۂ سازِ حیات!
تیرے ہر اک راگ میں پایا گیا رازِ حیات

تو نے خالد کی جواں مردی کو بخشی ہے بہار
تو نے طارق کی شجاعت کو کیا ہے آشکار

اللہ اللہ ترا انداز نگاہ خشم ناک
تو نے دنیا پر بٹھائی تھی صلاح الدین کی دھاک
تو نے بدلا ہر زمانے میں زمانے کا مزاج
اُف یہ افسانے ترے، تو کیا تھی کل تک اور آج!

ایک بوڑھے سے کباڑی کی دکان مرغوب ہے
دیکھتا ہے جو تجھے، کہتا ہے، لوہا خوب ہے
کیا ہوا وہ طمطراق و جوہر کامل ترا
کس قدر تاریک نکلا آہ مستقبل ترا

شکریہ، اے طنز فرما! اس کرم کا شکریہ
تیری ہمت کا، شجاعت کا بھرم کا شکریہ
میری بابت جو کہا جائے بہ جا بالکل بہ جا
یہ جمود بزدلی کس کی خطا؟ میری خطا!

میں تو خود چلتی تھی شاید دشمنوں کے حلق پر
میں ہی لے آتی تھی رن میں غازیوں کو کھینچ کر
میں نے ہی برپا کیے ہنگامہ ہائے کارزار
میں ہی آجاتی تھی شاید ہو کے گھوڑوں پر سوار
حیف اے ناعاقبت اندیش تیری عقل پر
تجھ کو بالکل ہی نہیں ہے امتیاز خشک و تر

Rekhta Download.com

خالد و طارق کی فطرت کیا تھی اتنا سوچ تو
غازیٔ سلطان صلاح الدین کی منشا سوچ تو

ان کی فطرت تھی، شجاعت انکا مسلک تھا کمال
تیری فطرت بزدلی ہے تیرا مسلک ہے زوال

اُن کے سینوں میں تموج خیز تھا شیروں کا دل
تیرے سینے میں بھی دل ہے، اور کتنا مضمحل

رہتے تھے ان کے دماغوں میں خیالات بلند
تو نے سر پر ڈال رکھی ہے غلامی کی کمند

جس کا لوہا اصل ہو، رہتے ہیں اس کے دم وہی
تجھ میں کچھ ہمت نہیں ہے میرے پیچ و خم وہی

"وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں"

RekhtaDownload.com

۱۴

بوڑھا شاعر

میں وہ شاعر ہوں جسے صَبا احساس کہو　　میں نے محسوس کیے ہیں غم و راحت کے فریب
میں وہ شاعر ہوں جسے صَبا ادراک کہو　　میں نے سمجھے ہیں زمانے کے فراز اور نشیب

اے بڑھاپے! تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

صرف یوں نا! کہ جوانی کا سمے بیت گیا　　صرف یوں نا! کہ ضعیفی کا ہے دورہ مجھ پر
صرف یوں نا! کہ وہ جذبہ نہیں وہ جوش نہیں　　صرف یوں نا! کہ امنگوں میں نہیں طلب و نظر

اے بڑھاپے! تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

صرف یوں نا! کہ حسینوں سے بہت دور ہوں میں　　صرف یوں نا! کہ وہ رعنائی نظارہ نہیں
صرف یوں نا! کہ حقائق نگری شیوہ ہے　　صرف یوں نا! کہ نگاہیں بھی آوارہ نہیں

اے بڑھاپے! تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

صرف یوں نا! کہ میں جذبات کی رو میں بہہ کر　　اپنے جذبات کو مجروح نہیں کر سکتا
صرف یوں نا! کہ سمجھتا ہوں میں خدا کا رخ　　اور جذبات کے غلبے سے نہیں ڈر سکتا

اے بڑھاپے! تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

صرف یوں کیوں مرے بالوں پہ سفیدی چھائی　　جھریاں کیوں مرے چہرے پہ نمودار ہوئیں
صرف یوں کیوں مرے ہاتھوں میں ہے رعشہ کا اثر　　جنبشیں کیوں مرے قدموں کیلئے بار ہوئیں

اے بڑھاپے! تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

میں جو مر جاؤں تو ہو جائے زمانہ خاموش　　گلشنِ دہر میں بلبل کی طرح چہکے گا کون
میں جو مر جاؤں تو چھا جائے خزاں شے شے پہ　　گلشنِ دہر میں پھولوں کی طرح مہکے گا کون

اے بڑھاپے! تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

میں جو مر جاؤں تو دنیا کے قدم شل ہو جائیں　　کون ہر جادۂ منزل کو ہر کرے گا تعبیر
میں جو مر جاؤں تو دنیا میں تباہی آ جائے　　کون طوفان کو ساحل سے کرے گا تعبیر

اے بڑھاپے! تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

میں جو مر جاؤں تو افسانۂ گیسوئے حبیب　　گر گھٹا جھوم کے برسی تو مزا کیا دے گا
میں جو مر جاؤں تو افسانۂ رخسارِ حبیب　　رات میں چاندنی چھٹکی تو مزا کیا دے گا

اے بڑھاپے! تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

میں جو مر جاؤں تو یہ مے کدۂ حسن و جمال　　لاکھ پر کیف ہو ویراں ہی نظر آئے گا
میں جو مر جاؤں تو ہوگا نہ ثناخواں کوئی　　دفترِ حسن کا شیرازہ بکھر آئے گا

اے بڑھاپے! تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

میں جو مر جاؤں تو دنیائے محبت مٹ جائے　　کون ان اہلِ محبت کو سہارا دے گا
میں جو مر جاؤں تو حالاتِ شبِ فرقت کے　　کون شعروں میں ہر انداز سے پھر لکھے گا

اے بڑھاپے! تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

میں جو مر جاؤں تو سرمایہ پرستی کیلئے　　کوئی اندیشۂ تنقید نہ رہ جائے گا
میں جو مر جاؤں تو ان بوالہوسانِ زر کا　　ایک طوفان سا ہر سمت امنڈ آئے گا

اے بڑھاپے! تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

میں جو مر جاؤں تو یہ راہ برِ قوم و وطن ناخدائی سی خدائی کا کریں گے دعوے
میں جو مر جاؤں تو ہو جائیں یہ از خود رفتہ ان فراعین کیلئے کون بنے گا موسےٰ

اے بڑھاپے تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

میں جو مر جاؤں تو اربابِ حکومت کو بھلا کون آئینۂ احساس دکھائے گا
میں جو مر جاؤں تو یہ راہ بھٹک جائیں گے کوئی روکے گا نہ ٹوکے گا، نہ سمجھائے گا

اے بڑھاپے! تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

یہ بلکتے یہ سسکتے یہ تڑپتے انساں ان غریبوں کا کسے درد گوارا ہوگا
قافلہ قافلہ، دریوزہ گراں فاقہ کشاں میں جو مر جاؤں تو کون ان کا سہارا ہوگا

اے بڑھاپے! تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

کون کھینچے گا کسانوں کے الم کا نقشہ جن کے چہروں پہ نمودار ہیں دق کے آثار
کون مزدور کی حالت پہ کرے گا ماتم جو ساکرتا ہے لہو جن کا گروہ زردار

اے بڑھاپے تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

میں جو مر جاؤں تو دنیا میں خلا پڑ جائے ناقدِ دہر بھی ہوں اور مصور بھی ہوں میں
مرے نغموں کو ترس جائے گا دورِ حاضر وقت کا اپنے مغنی بھی ہوں شاعر بھی ہوں میں

اے بڑھاپے تو مجھے موت کا پیغام نہ دے

میں کہ شاعر ہوں جواں ہوں جواں ہمت ہوں اور شاعر پہ بڑھاپا کبھی آسکتا نہیں

Rekhtadownload.com

قائدِ حال ہوں پیغمبرِ مستقبل ہوں
اور مجھ کو ملک الموت مٹا سکتا نہیں

اے بڑھاپے تو مجھے موت کا پیغام نہ دے
(۱۵ نومبر ۱۹۵۷ء)

گھٹا

وہ ہمالہ سے اٹھی کالی گھٹا گاتی ہوئی
صبح کی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ اٹھلاتی ہوئی

باہمہ اندازِ بے تابی و با صد اضطراب
جیسے مہ پاروں کے گیسو، مہر پاروں کی نقاب

لالہ رخساروں کا سایہ، سرمگیں آنکھوں کا مد
مصدرِ صبحِ بنارس، مرکزِ شامِ اودھ

آرزوں کی جوانی، سانولے پن کی بہار
عشقِ مجنوں کا سلیقہ، حسنِ لیلےٰ کا نکھار

کوہکن کا خواب، وامق کی امید کامیاب
جیسے شیریں کی ادائیں، جیسے عذرا کا شباب

اضطرارِ عاشقی، شوخیِ آہوئے ختن
ہر ادا میں ایک رومانی سمندِ موج زن

خم بہ دوش و مے فروش و بادہ بار و برق وش
ہر تحرک میں جوابِ نعرہ ہائے العطش

گود میں اپنی سجائے سازِ بزمِ اندری
رقص فرما چرخِ نیلی فام پر نیلم پری

حسن و الفت کے کلیسا کی دوشیزہ راہبہ
شام کی رقاصہ، شب کی ضو، سحر کی مطربہ

مخزنِ حسنِ عقیدت، منبعِ حسنِ بلقیس
خانۂ کعبہ کا پردہ، طور کی لوحِ جبیں

حسن پستی کی حجابی، حسنِ رفعت کی دمک
سایہ دارِ سطحِ ارض و غازۂ روئے فلک

سوئے مشرق اک لپک گہ سوئے مغرب اک لپک
مضطرب چشمِ غزالانِ ہمالہ کی جھپک

کاکلوں کو بازوں پر اپنے پھیلائے ہوئے
رات کی بیٹی ولائی سرمئی اوڑھے ہوئے

اپنے پہلو میں لئے کتنے ہی دلکش واقعات
سوتے سوتے چونک اٹھی مالوے کی جیسے رات

اپنے ہونٹوں پر لیے ہر نغمۂ دل شاد کن — گومتی کا گیت، گنگا کی غزل، جمنا کی دھن
ہر ادائے مستی و ناز تکلم ساتھ ساتھ
مشتری کا رقص، زہرہ کا ترنم ساتھ ساتھ
دل کی ٹھنڈک کا ذریعہ شربتِ سرد آنکھ کا — آگ میں سوتی زمیں کی تشنگی کا آسرا
دوش پر رکھے ہوئے مینائے صہبائے حیات — جس کی اک اک بوند میں سو سو تقاضائے حیات
مسکراتے لہلہاتے سبزہ زاروں کی بنا — سنبلستانوں کی خالق، کشت زاروں کی خدا
دیدۂ فطرت کی پتلی، بحر و بر کی آبرو — فیض بخشِ گل بہ گل، غنچہ بہ غنچہ، کو بہ کو
زندگی کے گلشن و صحرا کو مہکاتی ہوئی — عطر برساتی ہوئی ذروں کو سوندھاتی ہوئی
آ رہی ہے لڑکھڑاتی، دندناتی، جھومتی — نغمے غنچوں کو عطا کرتی، گلوں کو چومتی
کتنی یادوں کے جنازے دوش پر رکھے ہوئے — کتنے رومانوں کے لاشے دوش پر رکھے ہوئے
کتنے ہی بھولے ہوئے قصوں کو دہراتی ہوئی — کتنے ہی خوابیدہ ارمانوں کو چونکاتی ہوئی
کتنے ہی ارمان زدوں کو آسرا دیتی ہوئی — کتنے ہی بجھتے چراغوں کو جلا دیتی ہوئی
کتنے ہی مردہ دلوں کو مضطرب کرتی ہوئی — کروٹیں لینے لگیں گی حسرتیں مرتی ہوئی
کوئی یاد آئے گا میں دل تھام کر رہ جاؤں گا
مدتوں پھر سر در و دیوار سے ٹکراؤں گا

(۲۹ جون ۱۹۵۶ء)

تقاضائے وقت

وہ مرغِ صبح گاہ نے اذان دی وہ پو پھٹی
وہ طائرانِ خوش نوا نے صبح کی نوید دی
وہ عاشقانِ تشنہ کام نے کہیں کی راہ لی
تحرکِ سکوتِ شب، حجابِ شب اٹھا گیا

مسافرِ حیات اُٹھ! سفر کا وقت آگیا

وہ دیکھ! آفتاب کی چمک رہی ہیں سرخیاں
نظر اُٹھا، ہمالہ کی دمک رہی ہیں چوٹیاں
وہ دیکھ! گوشے گوشے پر کڑک رہی ہیں بجلیاں
فلک سے لے کے تا زمیں تمام نور چھا گیا

مسافرِ حیات اُٹھ! سفر کا وقت آگیا

وہ دیکھ! شہر کی ہما ہمی ہے انتظار میں
وہ دیکھ! دشت و کوہ کی خوشی ہے انتظار میں
وہ دیکھ! باغ کی کلی کلی ہے انتظار میں
جو سوئے گا وہ کھوئے گا جو جاگ اٹھا وہ پا گیا

مسافرِ حیات اُٹھ! سفر کا وقت آگیا

وہ دیکھ! مفلسوں کی بےکسی کو انتظار ہے
وہ دیکھ! ظالموں کی سرکشی کو انتظار ہے
وہ دیکھ! اقتدار کی خودی کو انتظار ہے
سرِ غرور توڑ دے، قدم تو ڈگمگا گیا

مسافرِ حیات اُٹھ! سفر کا وقت آگیا

وہ دیکھ! بھیڑیوں نے بکریوں کو کر لیا شکار
وہ دیکھ! فاقہ کش دوشیزگی کا لٹ گیا سنگھار
وہ دیکھ! جبر و ظلم کا شباب پر ہے کاروبار
وہ دیکھ! آدمی کا روپ آدمی مٹا گیا

مسافرِ حیات اُٹھ! سفر کا وقت آگیا

نئے نئے سبو، مغ بچے، نئے نئے سے جام دیکھ! نئے نئے سے ضابطے، نئے نئے سے کام دیکھ!
سلوکِ بیش و کم کے ساتھ فرقِ خاص عام دیکھ جو بزمِ خاص میں گیا، عوام کو بھلا گیا

مسافرِ حیات اٹھ! سفر کا وقت آگیا

نئے نئے سے رہنماؤں کا نیا خیال دیکھ! نئی نئی حکومتوں کا رنگ بے مثال دیکھ!
حکیمانہ شان دیکھ! شاطرانہ چال دیکھ! یہ خود غرض گروہ شمعِ ارتقا بجھا گیا

مسافرِ حیات اٹھ! سفر کا وقت آگیا

یہ ٹھگ، یہ دزدِ روزِ روشن، یہ راہزن، یہ بھیڑیے نئے نرالے روپ میں وہ جا رہے ہیں سامنے
بچے بچے، کھچے کھچے، دبے دبے، چھپے چھپے تبادے بڑھ کے دَور داؤ پیچ کا چلا گیا

مسافرِ حیات اٹھ! سفر کا وقت آگیا

جفا و جبر و ظلم کا بہانہ بے گناہیاں مشاہداتِ قلب نے رخ ثبوت کی گواہیاں
ہر اک طرف اداسیاں ہر اک طرف تباہیاں زمانے کو جھنجھوڑ کر، زمانہ خود جگا گیا

مسافرِ حیات اٹھ، سفر کا وقت آگیا

وہ ننھی ننھی بچیوں کے چہرہ ہائے زرد زرد وہ نوجواں بہادروں کے عزم ہائے سرد سرد
وہ بوڑھے والدین کی نظر اداس دل میں درد سماج انہیں تباہیوں کے غار میں گرا گیا

مسافرِ حیات اٹھ! سفر کا وقت آگیا

جوان ماں کی چھاتیوں کا دودھ خشک ہو گیا وہ شیر خوار بے زباں تڑپ تڑپ کے سو گیا
وہ ماں کی گود لٹ گئی، وہ باپ ہوش کھو گیا مگر یہ وارثانِ قوم خوش ہیں ان کا کیا گیا

مسافرِ حیات اُٹھ! سفر کا وقت آگیا

ہوا کے جھونکے گرم آئے، اور خنک گذر گئے   سمندروں کے مدوجزر تیز ہو کے رک گئے
زمیں لرز کے رہ گئی تو آسمان جھک گئے   ہر ایک اقتضائے وقت کا سراغ پا گیا

مسافرِ حیات اُٹھ! سفر کا وقت آگیا

۱۲۱ر اگست ۱۹۵۲ء

ہاتھی کے دانت

ابھی تو گونج رہی ہے وہ داستانِ حیات — کہ تھی ہمارے سلف میرِ کاروانِ حیات
ابھی تو یاد ہے وہ دورِ عنفوانِ حیات — کہ اتباع میں تھے سارے نکتہ دانِ حیات
اصول وضع کیے تھے حیاتِ انساں کے
اٹھا دیے تھے حجابات رازِ امکاں کے

وہ داستاں کہ زمانے نے اس کو دہرایا — ہر ایک لفظ سے اس کے نیا سبق پایا
ہر ایک جملے نے، رازِ حیات سمجھایا — بدل بدل کے ذرا رخ سبھی نے اپنایا
نظام جس نے مرتب کیا برائے حیات
وہ داستاں ہی رہی ذہن میں بنا کے حیات

کسی نے مجلسِ شوریٰ کی نعمتیں لے لیں — کسی نے عہدِ خلافت کی عظمتیں لے لیں
کسی نے خلق و محبت کی دولتیں لے لیں — کسی نے سازِ مساوات کی گتیں لے لیں
ہر اک نے حسبِ غرض مسخ کر کے اپنایا
خود اختراع ہے یہ رنگ بھر کے اپنایا

وہ اک نظام کہ مخزن تھا ہر فضیلت کا — شجاعتوں کا، مساوات کا، اخوت کا

یقیں کا، عزم کا اخلاق کا محبت کا
مجاہدات کا انسانیت کی خدمت کا

زمانہ ساز، زمانے میں جب ابھر کے اُٹھے
اُسی نظام میں کچھ کانٹ چھانٹ کر کے اُٹھے

بتا رہے ہیں جسے سب نظام جمہوری
وہ اپنی مجلسِ شورےٰ کی نقل اڑائی ہوئی
کہا گیا جسے "ڈکٹیٹری" کی نے تنگی
وہ اک بگاڑی ہوئی نوعیت خلافت کی

"کمیونزم" جسے کہہ رہے ہیں اہلِ جہاں
وہ اپنی شانِ مساوات کا مٹا سا نشاں

بدل بدل کے کچھ انداز محفلِ شب کے
فریبِ صبح کے پردے میں دل لئے سب کے
اُڑھا اُڑھا کے لبادے نئے نئے ڈھب کے
اصول وضع کئے خیر باد مذہب کے

یقین چھین کے روحانیت کی مستی کا
دیا تو وہم دیا مادہ پرستی کا

وہ مادہ کہ پرستش سے جس کی کبر بڑھے
وہ مادہ کہ نمائش سے جس کی عجز مٹے
وہ مادہ کہ خدائی میں جس کی سکھ نہ ملے
جو کام آ بھی سکے کچھ تو خود پرستی کے

خلا میں چاند کے راکٹ پہنچ تو جائیگا
انانیت کے علاوہ مگر وہ کیا دے گا

ہو جس نظام کی تخلیق، زر پرستی سے
ہو جس نظام کا آغاز محض روٹی سے
ہو جس نظام کی تشکیل "نقد بندی" سے
ہو جس نظام کی تعمیر، نعرہ بازی سے

تضاد، قول و عمل میں جہاں نمایاں ہو
حقیقتوں کا وہاں چاند کیا درخشاں ہو

وہ کل کا "مارکسزم" آج کب رواج میں ہے
"وہ لینن ازم" کہاں ہے جو اندر آج میں ہے
"کمیونزم" بدلتے ہوئے مزاج میں ہے
مریضِ عشق "خروشچیف" کے علاج میں ہے

ہوئیں ہیں اور ابھی ہوں گی کتنی ترمیمیں
رہیں گی تشنۂ تکمیل پھر بھی تنظیمیں

جب اعتدال نہ ہوگا کسی فسانے میں
تو اشک آپ ہی اُمڈیں گے مسکرانے میں
زیادہ ظرف سے پی کر شراب خانے میں
وہ کتنے ہیں جو بہکتے پھرے زمانے میں

کبھی چلے ہیں اصول، انتہا پسندی کے
حدوں میں رہتے ہیں انداز سربلندی کے

وہ کیا نظام، بغاوت ہو جس میں فطرت سے
وہ کیا نظام، جو بیزار ہو نصیحت سے
وہ کیا نظام، عداوت ہو جس کو سیرت سے
بعید تر ہو جو اخلاق سے، محبت سے

جہاں "مشین" میں کہنے کو کارساز ڈھلیں
مگر، محاسنِ باطن سے بے نیاز ڈھلیں

جہاں رواج ہو مکاریوں کا مطلقاً
جہاں جواز ہو جبر و ستم کا اخلاقاً
جہاں بیان ہو مزدور، راج کا رسماً
جہاں نمود مساوات ہو تو تکمیلاً"

فسانہ کچھ ہو تو عنوان ہوں فسانے کے کچھ
کہ دانت ہاتھی کے کھانے کے کچھ دکھانے کے کچھ

جہاں جماعت محنت کشاں سبھی کچھ ہو   وہاں اُسی کو رہے برتری کوئی کچھ ہو
وہاں یہ فکر، کہ اُجرت میں تو کمی کچھ ہو   "خرو شجیف" کا معیارِ زندگی کچھ ہو
اُسی طرح سے "خرو شجیف" بھی کریں گے بسر
کہ جس طرح سے گذاریں گے اُرزنؔ باور

جہاں نظام مساوات سے یہ نسبت ہو   کہ جو بیان ہو بے گمانہ حقیقت ہو
جہاں شرافت اخلاق وجہ ذلت ہو   اُسے فریب کہیں، جو نظام فطرت ہو
فریب وہ ہے حقیقت کا جس نے درس دیا؟
شرافت اور اخوت کا جس نے درس دیا

وہی نظام کہ لرزا دیا تھا شاہوں   غرور مندوں کو، خود ساختہ خداؤں کو
طریقِ زیست سکھا کر زمانے والوں   جنم دیا ہے اُسی نے کئی نظاموں کو
اُسی نظام پر آج اعتراض ہوتے ہیں
اور اس لئے کہ جو، وارث ہیں اُس کے سوتے ہیں
وہ اک حقیقت پاکیزہ و جمیل و حسیں   وہ نعمتوں کا خزانہ وہ اک مکمل دیں
وہ زندگی کا محافظ، وہ آخرت کا امیں   وہ آج بھی ہے وہی کچھ، مگر بہ شرط یقیں
جو آج اُس کے پرستار گام زن ہو جائیں
تو خارزارِ حیات اِک چمن ہو جائیں
خدا کی شان، انھیں اعتراض کی جرأت   فریب کار عمل جن کا موجب شہرت

نہ جن میں خلق، نہ تقویٰ نہ اور کوئی صفت جو لازمی ہے برائے اساس ہر ملت
وہ رہ نمائی کریں گے حیاتِ انساں کی
بجھا کے شاد ہیں شمعیں جو نورِ ایماں کی

۱۷ر نومبر ۱۹۵۹ء

RekhtaDownload.com

غزلیات

از ۱۹۲۸ء تا ۱۹۴۰ء

RekhtaDownload.com

کرم فرما کو مجبوراً پڑا نامہرباں ہونا — کہ تھا مرقوم قسمت میرا رسوائے جہاں ہونا
مری ہر ایک جنبش پر نظر رہتی ہے محفل کی — سلیقے سے اگر دامن کو آتا دھجیاں ہونا

مہیا ہو چکے ہیں موت کے اسباب اے محشرؔ!
بہت دشوار ہے اب ارتباطِ جسم و جاں ہونا

مرے اللہ آغازِ الم انجام ہو جائے — کہ صبحِ ہجر میری زندگی کی شام ہو جائے
نہیں قسمت میں گر صبحِ بہارِ باغ تو یارب! — قفس تک جاتے جاتے زندگی کی شام ہو جائے
یہ ممکن ہی نہیں میری جبینِ شوق کے ہوتے — کہ تیرا سنگِ در اور سجدہ گاہِ عام ہو جائے

چمن بہتر کہ دنیائے قفس، اسکو خدا جانے — بہرحالت مرتب کر رہا ہوں چند افسانے
یہ جب طے پا گیا کشتی تھپیڑے کھا کے ڈوبیگی — تو اب موجوں کے رخ کو کون دیکھے کون پہچانے
مگر ہاں! قید کے حالات کچھ رنگیں بنانا ہیں — اجازت ہو تو مل بیٹھا کریں دو چار دیوانے
محبت میں طوافِ شمع ہی کافی نہیں ہوتا — یہاں تو جان دیکر زندگی پاتے ہیں پروانے
جہاں میں چلتے چلتے سوچ کر کچھ، مسکراتا ہوں — وہاں اکثر ہنسا کرتے ہیں مجھ پر بعض دیوانے

Rekhta Download.com

قفس میں ہوں مگر گلشن پر اتنا حق سمجھتا ہوں / وہ تنکے سوکھ جائیں جن پہ لکھ دو میرے افسانے
کسی کی یاد میں رو رو کے اکثر شعر کہتا ہے
وہی محشرؔ جسے اب کوئی دیکھے تو نہ پہچانے

راحتیں اور اس اسیرِ رنج و حرماں کے قریب / جو نہ رہ سکتا ہو چھپ کر بھی گلستاں کے قریب
اسکو فطرت کہیئے، یا فنِ جنوں کہہ لیجئے / ہاتھ جب اٹھے گا، آئیگا گریباں کے قریب
وہ اگر اٹھنے سے پہلے دیکھ لیں اس ہاتھ کو / جو پہنچا جا رہا ہے ان کے داماں کے قریب
توڑ دیتا ہوں یکایک، ہمتیں ساحل کے پاس / بہتے بہتے پہنچ جاتا ہوں طوفاں کے قریب
سارے دیوانے نگہباں! ایک سے ہوتے نہیں / چھوٹ کر کچھ بیٹھ بھی جائینگے زنداں کے قریب
اب مری مجبوریوں کی نوعیت کو دیکھیے / گل نگاہوں کے قریب اور خار داماں کے قریب
دل میں دھڑکن، پانو میں لغزش، نگاہیں بے قرار
شاید آ پہنچا ہوں محشرؔ! کوئے جاناں کے قریب

کون آیا سارے وحشی بے خبر کیوں ہو گئے / دشمنِ دیوار و در، دیوار و در کیوں ہو گئے
جب کسی منظر کو دیکھا اور دل جیسی ہوئی / وہ خدا جانے مرے پیشِ نظر کیوں ہو گئے
چھا گئے بادل، ہوائیں چل پڑیں، گل کھل چکے / وہ نہ آئیں گے تو ساماں اس قدر کیوں ہو گئے
آؤ لو اب سامنے آ جاؤ، آخر تاب کے / تم کو چھپنا تھا تو مقصودِ نظر کیوں ہو گئے
یہ بہارِ غنچہ و گل یہ فروغِ مہر و ماہ / اس طرح تم زینتِ شام و سحر کیوں ہو گئے
عمر ہی یوں تو بسر کرنی ہے، لیکن ان بغیر / بعض دن ایسے بھی آئے جو بسر کیوں ہو گئے

بڑے اچھے بڑے سیدھی کہیں کے — ذرا دھبّے تو دیکھو آستیں کے
ابھی تم ہو تو اک دن دیکھ لوگے — کہ ہم ایسے نہ دنیا کے نہ دیں کے
مرے دامن میں موتی بھر دئے ہیں — سلیقے دیکھئے چشمِ حزیں کے
جنابِ شیخ حور و خلد اور ہیں — اُنھیں کے تذکرے کیجئے اُنھیں کے
یہ نازِ دل رُبائی اللہ اللہ — زباں پر ہاں، مگر تیور نہیں کے
میں پھر افسانۂ غم چھیڑتا ہوں — ذرا تم پھر کہو "جھوٹے کہیں کے"

جنھیں محشرؔ! ہم اپنا جانتے تھے
وہ آخر بن گئے سانپ آستیں کے

لب پر آہیں ہیں مناجاتیں ہیں — آپ کی یاد ہے اور راتیں ہیں
لو منا کر بھی انھیں دیکھ لیا — وہی عادت ہے وہی باتیں ہیں
اب تصور میں نہ آئے کوئی — غم کی راتیں ہیں، مری راتیں ہیں
خود ہی میں ہونٹ سیئے بیٹھا ہوں — ورنہ کہنے کو بڑی باتیں ہیں
غصہ بھی لاؤ، قسم بھی کھاؤ — جب نہ ملنا ہو تو سو باتیں ہیں

درد ہو یا غم دوری محشرؔ!
وہ اگر بخشیں تو سوغاتیں ہیں

جب تصور نے کے پہنچا دیا کسی حد پر مجھے — تم خدا جانے نظر آئے ہو کیوں اکثر مجھے
کسقدر رنگین تصور کسقدر دلکش خیال — وہ نگاہیں اور تحریکِ مے و ساغر مجھے

وہ گلی آنے تو دو، وہ آستاں آنے تو دو　　خود بخود آگاہ کر دیگا دلِ مضطر مجھے
میں بھی اتنی مرتبہ سجدے کرونگا شکر کے　　آپ جتنی مرتبہ گذریں گے ٹھکرا کر مجھے

نام جب دنیا کا آتا ہے لرز جاتا ہوں میں
اسقدر دنیا نے ٹھکرایا ہے اے مختشر! مجھے

از ۱۹۳۱ء تا ۱۹۶۷ء

سعیِ حیات میں مری ضبط ہے خامیاں نہیں
اُس سے فریب کھاؤں گا جس کی طرف گماں نہیں
مضحکہ خیزیاں مجھے سب کی قبول ہیں، مگر
وہ نہ ہنسے کہ جس کے پاس ایک دل و زباں نہیں

حیف یہ کم نگاہیاں اور غمِ تجلیات
اُس کو وہاں نہ دیکھیے، میری نظر جہاں نہیں
دل کشیِ قفس تمام اک طرف، اور اک طرف
ایک خفیف سا خیال، گل نہیں آشیاں نہیں

ہاں بہ ظاہر کوئی تکلیف تو زنداں میں نہیں
دھیان ان باتوں کا آتا ہے جو امکاں میں نہیں
پہلی منزل کے جنوں والوں پہ رشک آتا ہے
ہائے وہ ہاتھ جو مدت سے گریباں میں نہیں

نیند ان کی اُچاٹ ہو گئی ہے — آنکھوں میں شراب ابل پڑی ہے
بے چین ہے دل، اچاٹ ہے دل — بستی بس کر اُجڑ گئی ہے

کلیوں کی صدا بھی سنتے جاؤ
افسانہ قریب ختم ہی ہے
غم اتنے اٹھاؤں گا کہ دنیا
خود کہنے لگے یہ آدمی ہے
کچھ اور نواز شیں، کہ دل میں
تھوڑی تھوڑی سکت ابھی ہے
اک گھن سا لگا ہوا ہے جی کو
جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے
میری شب غم دلھن نے جیسے
چوٹی بل دے کے کھول دی ہے

غم بہار خزاں اثر کا علاج ہوگا یہ سوچنے سے
محل کے فانوس کیوں منور، چراغ خس خانہ کیوں بجھے سے

مری شب انتظار ہی کی سحر ہوا چاہتی ہے شاید
نشاط بردوش آ رہے ہیں ہوا کے جھونکے نئے نئے سے

کسی کے ہاتھوں میں ہاتھ دیکر کہیں زمانہ بھی سر ہوا ہے
کہ کے قدم راہِ زندگی میں چلو گے تجھ مجھ کے آسرے سے

تصور انقلاب کی ہیں وہی محل اب پناہ گاہیں
جہاں امارت کی پیاس بجھتی تھی بے کسوں کا لہو پیے سے

بس اب نہیں دور صبح فردا، اور ایک شب کا گذارنا کیا
جو آج آنکھیں دکھا رہی ہیں وہ پیچ کو گذریں گے سامنے سے

یہ شمع بزم طرب نہیں ہے، یہ قلب سوزاں ہے غم زدوں کا
کہاں کہاں اور نہ جانے کتنے دیے جلاؤں گا اس دیے سے

کر تجدید روایاتِ کہن آج بھی ہے
حق بیانی کا صلہ دار و رسن آج بھی ہے

پاسبانانِ چمن کی روش کورانہ
وجہ رسوائیِ آئینِ چمن آج بھی ہے

ے پندار کے دو گھونٹ کی برداشت کیسے
تھا جو پہلے وہ بہکنے کا چلن آج بھی ہے

رہ نما ہیں کہ سرِ راہ، اڑے بیٹھے ہیں
کارواں ہے کہ سزاوارِ محن آج بھی ہے

وقت کے نبض شناسوں سے کہو تیز چلیں
خود فریبوں کی جبینوں پہ شکن آج بھی ہے

کر چکا ہے جو ہر اک دور میں تریاق کا کام
میرے ساغر میں وہی زہرِ سخن آج بھی ہے

وہی محشر جو نگاہوں میں کھٹکتا ہی رہا
اپنی بے باک بیانی پہ مگن آج بھی ہے

(۲۳-اپریل ۱۹۵۵ء انڈرن جیل)

اُن سے کیا غم کی شکایت کی جائے
کہ جنھیں دیکھ کے غم یاد نہ آئے

کیوں بڑھاتے ہو محبت اتنی
چار دن بعد تباہی بھی نہ جائے

اب یہاں ہوں کہ شگوفہ کوئی
مسکرایا مرے آنسو بھر آئے

آج وہ سو نہ سکے ہیں شاید
آج آنکھوں کا وہ عالم ہے کہ ہائے

یہ تو مجبور کی عادت ٹھہری
ٹھوکریں کھائے، مگر آس لگائے

موت ہاں موت تو آساں ہے، مگر مشکل ہے
زندگی، جس کا سلیقہ ابھی انساں میں نہیں

آپ کو دیکھتے رہنے سے، سکوں ملتا ہے
آپ کو دیکھتے رہنا مگر امکاں میں نہیں

برق چمکے گی تو دل کانپ اُٹھے گا محشر!
گو کہ تنکے بھی نشیمن کے گلستاں میں نہیں

کچھ سوچنا اور ان کی طرف دیکھنا مجھے
یہ سلسلہ رہا تو جنوں اب ہوا مجھے

یہ بھی ہوا ہے بیٹھے بٹھائے کسی طرف
یوں چل رہا ہوں جیسے کوئی لے چلا مجھے

یہ کون مستِ ناز تصور میں آگیا
ساغر کو سامنے سے ہٹانا پڑا مجھے

یہ بھی خیال ہے کہ زمانہ نہ کچھ کہے
پھر یہ بھی سوچتا ہوں زمانے سے کیا مجھے

یہ زندگیٔ عشق، اس پر اختیار کیوں نہیں
اور اختیار کچھ نہیں تو ناگوار کیوں نہیں

گنہ بھی کیوں رہے ہیں آخر انکے انتظار میں
یہ صبح و شام انھیں بھی انکا انتظار کیوں نہیں

تری نگاہ بے ارادہ حسنِ اتفاق ہے
مگر یہ حسنِ اتفاق بار بار کیوں نہیں

سبھی گناہ گار بھی وہ رند جو بہک گئے
مگر امیرِ مے کدہ گناہ گار کیوں نہیں

وہ بندۂ خدا جو آج بھی خدا نہ بن سکا
رسن بہ دست کیوں نہیں، رہینِ دار کیوں نہیں

بے نیازی کو محبت کا بھرم کہتے ہیں
خود پرستوں کو نہ سوجھے گی یہ ہم کہتے ہیں

مہربانی تری ہر بات کو ہم کہتے ہیں
انتہا ہے کہ تباہی کو کرم کہتے ہیں

جی میں آتا ہے کہ بت خانے کا رخ کر لیجیے
بات وہ راہ نمایانِ حرم کہتے ہیں

درِ جاناں ہے یہیں کوچۂ جاناں ہے یہی
میں کہوں یا نہ کہوں میرے قدم کہتے ہیں

ہاں نہ ہو گا انھیں احساسِ محبت لیکن
وہ جو کترا کے گذرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں

خیالوں پر مدارِ زندگی تھا عمر بھر بہکے
کبھی کچھ سوچ کر بہکے، کبھی کچھ سوچ کر بہکے

ہوا تو یہ کہ بہکائے گئے یا راہ پر بہکے
مگر وہ قافلے؟ جو انکا دامن تھام کر بہکے

وہ آیا جام بر کف خندہ بر لب زلف بر عارض
بتاؤ اب قدم بہکیں ہمارے یا نظر بہکے

ارادے مختلف، مقصد جدا، انجام ظاہر ہے
جہاں ہم راہ پر آئے وہاں کچھ ہم سفر بہکے

ہم ایسے بے یقینوں کا بہک جانا یقینی تھا
کہ ہم لیں تصور کے اٹھے تھے اگر بہکے

سوا اس آستاں کے سر کو جنبش ہو نہیں سکتی
جنونِ عشق کا مفہوم یہ کب ہے کہ سر بہکے

کرم آمادہ تھا پیرِ مغاں، اب کیسے رہ جاتے
یہ رندِ مصلحت پیشہ مناسب وقت پر بہکے

ترے سلوکِ تغافل سے ہو کے سودائی
چلا ہوں میں تو کچھ آگے چلی ہے رسوائی

نیا نیا ہے ابھی جذبۂ خود آرائی
خدا کرے کہ نہ آئے خیالِ یکتائی

جو آج ذکر چلا آستیں کے سانپوں کا
تو مجھ کو اپنے کئی دوستوں کی یاد آئی

طلب کی موت سمجھیے رہِ طلب میں قیام
بڑا غلط ہے تقاضائے آبلہ پائی

تمہاری یاد کو رہ رہ کے گھبرا لاتی ہے
مہ و نجوم کی تابش، گلوں کی رعنائی

حیاتِ عشق کے پیچ و خم، نشیب و فراز
انھیں کا نام ہے شاید کسی کی انگڑائی

طبیعتوں میں بڑا اختلاف ہوتا ہے
مجھے تو عرضِ تمنا پہ شرم سی آئی

وہ ابتدائے محبت کی گفتگو محشرؔ
بجا رہا ہو کوئی دور جیسے شہنائی

Rekhta Download.com

از ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۱ء

RekhtaDownload.com

٭

فتنۂ دہر سے دل لطف نظر مانگے ہے
آگ کے شعلے سے پانی کا اثر مانگے ہے

ہر طرف مصلحت وقت کے پہروں کا ہجوم
اور وحشت، وہی کوچہ وہی در مانگے ہے

نقدِ جاں، دولتِ دیں، جنسِ خرد، عظمتِ دل
جانے کیا کیا ترا اندازِ نظر مانگے ہے

منزلِ عشق کی دھن ہے نہ مداوائے الم
دلِ نافہم دعاؤں میں اثر مانگے ہے

کیا ضروری ہے کہ ہاتھ آئے کسی کا دامن
جانے کیوں دل کا لہو دیدۂ تر مانگے ہے

دل کی حسرت کا تقاضا کہ یہ گیسو سلجھاؤ
اہلِ دوراں کو شکایت کہ سحر مانگے ہے

کتنا اونچا ہے ترے دورِ ستم کا معیار
اب تو ناکردہ گناہی بھی سپر مانگے ہے

RekhtaDownload.com

کہاں کہاں کی دھوپ ہے، کہاں کہاں کے سائے ہیں
یہ دشت بھی پرائے ہیں یہ شہر بھی پرائے ہیں
شکستِ دل سے کتنے فاصلے تمام ہو گئے
شکستِ دل کے ساتھ ساتھ ہم بھی مسکرائے ہیں

یہاں سے دور ہٹ چلو ذرا سی رہ گئی ہے رات
کوئی برا نہ مان جائے جام کھنکھنائے ہیں
جنوں تو خود ہی کھول دے گا راستے کی گتھیاں
سکوں سے دیکھتے رہیں جو صاحبانِ رائے ہیں
بساطِ دل کی وسعتیں بھی تنگ ہو کے رہ گئیں
نہ جانے غم کے قافلے کہاں کہاں سے آئے ہیں
ابھی سے کیوں ہے جست جوئے سیل اشک ہائے غم
ابھی تو آپ جائیں گے، ابھی تو آپ آئے ہیں

Rekhtabooks.com

شمعِ رہ ایک ہی نقشِ کفِ پا تھا پہلے
جو بھی رہ رو تھا وہی راہ نما تھا پہلے

اب ذرا دیکھیے نا، بزمِ جہاں کی صورت
آپ کو شکوۂ اربابِ وفا تھا پہلے

پہلے طوفان بھی کترا کے گذر جاتے تھے
اے مرے سلسلۂ خواب میں کیا تھا پہلے

اب تصور بھی اگر آئے تو تہمت لگ جائے
کس قدر شہرۂ تسلیم و رضا تھا پہلے

اس نے یوں دورِ جوانی میں قدم رکھا ہے
ایسا لگتا ہے کہ میں تھا نہ خدا تھا پہلے

Rekhta Download.com

کچھ اس ادا سے وہ لے کر مرا پیام چلے
نسیم جیسے پسِ رخصتِ خرام چلے

سبو و خم سبھی خالی ہیں کیسے کام چلے
بہارِ نو کو صدا دو کہ دورِ جام چلے

غمِ فراق کے ماروں میں حوصلہ بھی کہاں
چلے تو صورتِ شب ہائے سست گام چلے

ابھی ہے بزمِ تمنا طلسمِ خواب و خیال
حدیثِ شوق چلے بھی تو ناتمام چلے

بہت دنوں تو چلا سحرِ گیسوئے شب رنگ
کوئی پیام برِ صبحِ لالہ فام چلے

کھنچے کھنچے سے رہے بھی تو کیا کیا حاصل
ہوا یہی کہ نگاہیں اٹھیں پیام چلے

یہ میں کہاں سے اٹھا ہوں شرابیوں کی طرح
نہ رقصِ دخترِ رز ہی ہوا نہ جام چلے

یہاں خموش ہے دستورِ زندگی مختصر
کہ مٹ کے نام چلے یا مٹا کے نام چلے

RekhtaDownload.com

زبانِ چشم وہ آئیں اگر تو چل نہ پڑے
بھرا ہوا ہے سمندر کہیں ابل نہ پڑے

نسیمِ صبحِ تمنا ذرا دبے قدموں
تمام رات کا جاگا ہوا اُچھل نہ پڑے

دل و دماغ معطر کئے ہوئے ہے وہ یاد
خدا کرے کہ ہواؤں کا رخ بدل نہ پڑے

ہر ایک بات زباں سے نکالنے کی نہیں
زمانہ کان لگائے ہوئے ہے چل نہ پڑے

اُداس اداس ہیں شہروں کے کوچہ و بازار
یہی جنوں ہے تو لے کر مجھے نکل نہ پڑے

نہ لاؤ دل کے قریب، آرزوں کی شمعوں کو
کہ یہ چراغ بہ دقّت بجھا ہے، جل نہ پڑے

بالیا طرحِ فیض مآبوں کے آس پاس
بھونروں کا رقص جیسے گلابوں کے آس پاس

بیٹھی ہوئی ہے منتظرِ بادِ صبحِ نو
موجِ سکوتِ بحر، حبابوں کے آس پاس

کتنے حسین جزیرے ہیں جو کچھ ہی دُور پر
آباد ہوتے جاتے ہیں خوابوں کے آس پاس

اے دورِ صبح و شام! ذرا تیز گام چل
رکتے نہیں ہیں خانہ خرابوں کے آس پاس

ہاں اب تو بڑھ چلیں افقِ مہر کی طرف
نظریں ذرا رکی تھیں حجابوں کے آس پاس

دیکھ اے جنوں! کہ سر بہ گریباں ہیں آج کل
کتنے سوال میرے جوابوں کے آس پاس

محشرؔ! نچوڑی جائیں اگر اپنے ہاتھ سے
دل جھومتا ہے ایسی شرابوں کے آس پاس

کچھ تو منظر ناہم خود بختیوں کے عادی ہیں
کچھ فضول رسمیں بھی زندگی پہ لادی ہیں

جب وفا کے افسانے چھائے ہیں مہک بن کر
بستیاں رچادی ہیں خلوتیں بسادی ہیں

پائے مال رستے پر ہر قدم نہ اٹھے گا
جاؤ قافلے والو! ہم تو اجتہادی ہیں

دشت دشت ناپا ہے شہر شہر گھوما ہوں
اور جو ارادے تھے وقفِ نامرادی ہیں

ان سنی سی آوازیں آرہی ہیں صحرا سے
کل کے منتظر شاید آج کے منادی ہیں

حوصلے تو قائم ہیں آرزو تو محکم ہے
لغزشوں پہ کیوں جاؤ وہ تو غیر ارادی ہیں

RekhtaDownload.com

نیند کی آنکھ مچولی سے مزا لیتے ہیں
پھینک دیتے ہیں کتابوں کو اٹھا لیتے ہیں

بھولا بھٹکا سا مسافر کوئی شاید مل جائے
دو قدم چلتے ہیں آواز لگا لیتے ہیں

ابر کے ٹکڑوں میں خورشید گھرا ہو جیسے
کہیں کہتے ہیں کہیں بات چھپا لیتے ہیں

یارو! اکتاؤ بیاباں سے تو زنداں میں چلو
لوگ شہروں میں ابھی نام وفا لیتے ہیں

آندھیاں تیز چلیں گی تو اندھیرا ہو گا
خود بھی ایسے ہیں چراغوں کو بجھا لیتے ہیں

جس طرح موج سمندر کی کہ اُبھرے رہ جائے
داستانِ غمِ دل خود ہی سنا لیتے ہیں

ذہن اُمید کی باہوں میں پلا کرتا ہے
تری تصویر بناتے ہیں سجا لیتے ہیں

ورق زیست کو رکھنا بھی ہے سادہ مخمورؔ
حال غم لکھتے ہیں اور اشک بہا لیتے ہیں

یہ جام مے سرِ محفل نہیں اگر پہنچے
تو اب نشہ بھی میری روح میں پہنچے

ہم ایسے لوگ اسی پر ہی اکتفا کر لیں
صدائے نغمۂ عشرت ہمارے گھر پہنچے

وہاں کوئی بھی نہیں التفات کا قائل
جہاں ہماری خبر ہم سے پیش تر پہنچے

یہ رہ گزر تری منزل سے دور ہے لیکن
وہاں تو پہنچیں جہاں تک یہ رہ گزر پہنچے

طلسم تیرہ شبی کا گھراؤ ایسا ہے
سلامِ شوق بھی تجھ کو نہ اے سحر پہنچے

اب آرزو کی حدیں وہ مقام ہیں کہ جہاں
قدم کسی کے نہ پہنچیں، اگر نظر پہنچے

جنوں پرستوں کی بستی ہے کوئی اے محشر
ہمارے شہر میں پہنچے تو سوچ کر پہنچے

شام جلیل

جلیل نعمانی

RekhtaDownload.com

راز یزدانی مرحوم

نام جلیل احمد خاں والد کا نام عزیز احمد خاں پیدائش ۲۲ جنوری ۱۹۰۸ء رامپور اُردو فارسی اور عربی کی تعلیم عام تھی کالج کی تعلیم کا رواج نہ تھا۔ اس لیے جلیل نعمانی اُردو فارسی اور قدرے عربی جاننے کے باوجود کوئی سند علمی نہ رکھتے تھے مگر جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ خود ان کی علمی قابلیت اور زندگی کی گہری بصیرت کی بڑی مستحکم دلیل ہے خاندانی شاعر ہیں اور اس قدر متعدی قسم کے چچا بھتیجے سے لے کر بھائی بہن بیوی بچے سب کے سب شاعر ہیں۔

جلیل نعمانی اور میں ۱۹۰۸ء کے پیدائش ہیں صرف فرق اتنا ہے کہ میری تاریخ پیدائش گیارہ اگست ۱۹۰۸ء ہے گویا جلیل مجھ سے تقریباً چھ مہینے بڑے ہیں ان کے بڑے ماموں امین الدین خاں عرف امن خاں مرحوم اور میرے والد میں بڑی دوستی اور اٹھنا بیٹھنا تھا۔ دونوں کو شطرنج کھیلنے اور کبوتر پالنے کا شوق تھا۔ اور امن چچا تو کبوتروں کے متعلق رام پور میں اپنے وقت میں خصوصی ماہرین میں شمار کئے جاتے تھے گو میرے والد کو ان کی دوستی کے باوجود ماہر فن ہونے کا شرف حاصل نہیں تھا۔ اس لیے یہ یقین ہے کہ یہ شوق بھی میرے والد نے ان کی دوستی ہی سے مستعار لیا ہوگا جلیل نعمانی بھی زیادہ تر اپنی نانی کے پاس ہی رہتے تھے اور میں بھی اپنے والد کے ساتھ امن چچا کے یہاں صبح شام دونوں وقت جاتا تھا۔ کوئی موسم ہو ان کے یہاں صبح کو کبوتروں کی باتیں زیادہ ہوتی تھیں اور شطرنج کبھی کبھی۔ لیکن شام شطرنج اور دوسری باتیں کبھی کبھی۔ اس سلسلہ میں جلیل سے روز ملاقات ہوتی تھی اور رکنے کی بات تو نہیں ہے مگر سن ہی لیجیے

اس زمانہ میں بھی جب ہماری عمر چھ سال سے زیادہ نہیں تھی اور میں اپنے ابتدائی مولوی صاحب سے مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے اردو کے قاعدے کے بعد ان کی پانا جانا یعنی پہلی کتاب پڑھ کے کچھ اس قسم کی فارسی پڑھ رہا تھا جس میں

ماتقیان کوئے دلداریم

کے معنی رٹائے جاتے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ دوسرے دن صبح کو مولوی صاحب قبلہ نے سبق سننے کے لئے کتاب اپنے ہاتھ میں لے لی اور ادھر کڑک کے فرمایا "ماتقیان کوئے دلداریم" اور ادھر ہم نے کم و بیش اسی قسم کی کڑک کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا "ہم رہنے والے گلی کے یار کی"۔ اور بدقسمتی سے کہیں ہم جھجک گئے یا اونگے تو حضرت مولانا محترم نے اپنی مخصوص قسم کے تنبیہ الغافلین سے ہمیں فوراً ہی بیدار فرما دیا جلیل صاحب بھی کم و بیش تعلیم کی یہی منزلیں طے کر رہے تھے ہاں تو ہم شاعر تھے اس زمانہ میں بھی۔ ہم یعنی میں اور جلیل دونوں بلکہ ایک شرف ہمیں اور بھی حاصل تھا یعنی اب اُردو کے شاعر ہیں اس وقت فارسی کے شاعر تھے دونوں یعنی ع نہ میں اس سے بہتر نہ وہ مجھ سے کچھ کم۔ بات یہ تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے پر اپنی فارسی دانی کا رعب جمانے کی کوشش فرمایا کرتے تھے اور اس رعب جمانے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ فارسی کے کی کمی نہ ان کے گھر تھی نہ ہمارے یہاں۔ روز سہ پہر سے فارسی کا کوئی دیوان اٹھایا اور جو غزل سامنے آئی نقل کر لی، انتہائی دیانت داری کے ساتھ یعنی مع شاعر کے تخلص کے ساتھ۔ کیونکہ اس زمانہ میں یہ جانتا ہی کون تھا کہ تخلص کسے کہتے ہیں۔ خیر تو ملاقات ہوئی تھوڑی دیر بزرگوں کے سامنے رہے پھر الگ آ بیٹھے اور بیٹھتے ہی یا جلیل نے پہل کر دی یا ہم نے۔ ایک غزل کہی ہے۔ دوسرا بولا سناؤ۔ بس جناب جیب سے پرچہ نکالا اور دھڑا دھڑ شعر پڑھ دیے مع تخلص تخلص کے۔ اب ایک پڑھ رہا تھا اور دوسرا تعریف کے ڈونگرے برسا رہا ہے چاہے شعر کے معنی کوئی نہ سمجھا ہو اور کم فہمی کی وجہ سے بلفظ بھی غلط ہی کیا ہو مگر جناب ع مستند تھا اپنا فرمایا ہوا۔ اس کے بعد دوسرے نے کہا ہم نے بھی غزل کہی ہے اب دوسرا پڑھ رہا ہے اور پہلا ہے کہ سر ہلا ہلا کر اور سینہ پھلا پھلا کر تعریف کر رہا ہے اب وہ دن وہ بات کہاں۔ یعنی ع وہ بھی کیا دن تھے الٰہی جب یہ دانائی نہ تھی ذیل کے

اشعار جلیل نعمانی کے ذیل کے اشعار جلیل نعمانی کے رنگ تغزل کو پیش کرتے ہیں ۔

آپ کا غم ہے پھر غم ہستی بے ثبات کیا
آپ کی جستجو کے بعد تذکرۂ حیات کیا
جوش جنوں نہیں ہوش کی طرز زمانہ ساز کیا
عشق کی عظمتوں کے ساتھ نسبت کائنات کیا
آپ نہ جن کے بن سکیں ہجر میں اسکے واسطے
انجمن خیال کیا ، بزم تصورات کیا
واقف نظم روز و شب حامل راز صبح و شام
سچ ہے جلیل آپ کو فکر تغیرات کیا

میں کہ آغاز محبت نہیں ہوں انجام طلب
مری ناکام طلب اُف مری ناکام طلب

ذوقِ ستم بھی ہے مری رسوائیوں کی آڑ — یہ چیز ہے ابھی نگہ رازداں سے دور

جو ان کے اختیار سے بھی مطمئن نہیں — اے ہمنشیں مجھے وہ تمنا ہے آج کل

ناصحِ کم نگاہ غور تو کر — ہم بھی حد سے اگر گذر جائیں

ہے ایسے ہی اگر اب کے بھی حالات بہار — آشیاں ہی کا قفس نام نہ ہو جائے کہیں

شغل شائستگی کیا کم ہے ارے دیوانے — ننگ حسن اگر جیب و گریباں پہ رہے

RekhtaDownload.com

وہ کلیم تھے انہیں چھوڑیے کہ یہ اپنا اپنا مذاق ہے
کبھی ہو سکا تو سنائیں گے اسی داستاں کے بدل کے ہم

لاکھ آزردگیٔ شوق سے مہلت نہ سہی
پھر بھی ہم اے غمِ جاناں ترے کام آئیں گے

پیامِ مرگ و جانِ زندگانی
جوانی ایک کافر کی جوانی

ستم چاہا بجائے قہر بانی
نہ مانی یہ بھی ظالم نے نہ مانی

یہ دنیا ہے ارے چپ رہنے والے
فسانہ بن نہ جائے بے زبانی

آدابِ احتیاط ہیں مجبوریوں کے نام
ہم کب ترے بغیر پریشاں نہیں ہوئے

جسے پامال تم نے کر دیا ہے
وہ امید اور محکم ہو گئی ہے

احتیاطؔ جنھیں در پردہ کیا ہے پامال
اب ترے نام کے ساتھ ایسے بھی نام آئیں گے

بہار آئی ہے اور آتی رہے گی
مگر وہ پھول جو مرجھا گئے ہیں

کسی امید پر سر کو جھکانا
خودی کی موت ہے سجدہ نہیں ہے

ہے منتظر بھروسہ ہے نفس سہارا
یہ میں کس زباں سے کہدوں وہ مہرباں نہیں ہے

یہ جو کہہ رہا ہے واعظ ہے بجا جلیل لیکن
اسے صرف اپنا غم ہے غم دو جہاں نہیں ہے

ابوالمجاہد زاہد

رامپور کو زمانہ قدیم سے مرکز علم و ادب اور گہوارہ شعر و سخن مانا جاتا ہے بڑے بڑے باکمال شعراء اس خاک سے ابھرے ہیں جنھوں نے اپنی فنی ریاضت سے شعر و غزل کی آب و تاب بڑھائی ہے۔ زمانہ قریب میں استاد ورشید، شاد، راز اور منے میاں صاحب ایسے باکمال شعراء گذرے ہیں جن کی ادبی و شعری خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

موجودہ دور میں بھی ایسے کئی خوش فکر اور پختہ گو شاعر ہیں جو اُردو شعراء میں ایک اونچا مقام رکھتے ہیں انھیں قابل ذکر اور قابل فخر شعراء میں ایک عظیم شاعر حضرت جلیل نعمانی بھی ہیں جن کی شخصیت اور شعری خدمات کا اعتراف کرنا ہمارا فرض ہے۔ جلیل نعمانی ایسے شاعر ہیں جنھیں نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا اور اسی استغنا کی بنا پر وہ رسائل و جرائد میں اپنا کلام بہت کم چھپواتے ہیں جس کی وجہ سے باہر کے ادبی حلقوں میں ان کی وہ شہرت نہیں ہے جس کے وہ مستحق ہیں اس کے باوجود بڑے بڑے اہل علم و اہل نظر نے ان کی اعلیٰ فنی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے، حضرت جگر مراد آبادی نے ایک مرتبہ لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں جلیل نعمانی کی بڑی تعریف کی اور ان کے کئی جلیل نعمانی کی بڑی تعریف کی اور ان کے کئی شعر سنائے جلیل نعمانی کی شاعری پر بھرپور تبصرہ تو مقالہ نگار حضرات ہی کر سکیں گے تاہم اتنا تو میں بھی عرض کر دوں کہ وہ غزل کے مزاج شناس ہیں، انھوں نے غزل کی تمام صحت مند روایات کو آگے بڑھایا ہے اور غزل کے کلاسیکل آب و رنگ کو بڑی فنکاری کے ساتھ بنایا ہے ان کی فکر میں رفعت، خیالات میں گہرائی اور احساس میں ہمہ گیری کی جھلک ملتی ہے۔

زبان کی روانی، روزمرہ کی صفائی، مصرعوں کی برجستگی بندش کی چستی حسن بیان و اثر آفرینی اور وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک اچھی غزل کے لیئے ضروری ہیں۔

جلیل نعمانی یوں تو حسن وعشق واردات وجذبات اور داخلی کرب وچپت کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے اپنی غزلوں کو حکایت بایار گفتن یا حدیث دلبری ہی تک محدود نہیں رکھا ہے ان کے یہاں کہیں کہیں غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں، اور غم انساں کی بھی جھلک پائی جاتی ہے اور حالات وواقعات حاضرہ کی طرف بھی بلیغ اشارے پائے جاتے ہیں بہتات نہیں ہے اسی کے ساتھ یہ بات بھی درست ہے کہ ان کے یہاں جدید کی بے راہروی اور بدکلامی بھی نہیں پائی جاتی ہیں شعرو ادب میں تجربات واجتہاد کا منکر نہیں ہوں لیکن اس کا قائل نہیں ہوں کہ جدت واجتہاد کو بچوں کا کھیل بنا دیا جائے۔ جدید شعراء نے غزل کو اس کی صنفی آرائش وزیبائش سے عاری کر کے ایک مکروہ ڈھانچہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

جلیل نعمانی غزل کے آداب ولوازمات سے واقف ہیں اور ان کی سختی سے پابندی کرتے ہیں وہ بڑی عرق ریزی اور حسن کاری سے شعر کی نوک، پلک درست کرتے ہیں وہ فکر وجذبہ کی رفعت کے ساتھ ساتھ اور زبان وبیان کی تمام نزاکتوں اور نفاستوں کا احترام کرتے ہیں اسی لئے ان کی غزلوں میں اثر بھی ہے اور جاذبیت بھی۔ رشید احمد صدیقی نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا ہے اور مسیحا نظامی نے جلیل نعمانی کو آبروئے غزل کے خطاب سے نوازا اور جلیل شاعر اسی خطاب کا مستحق بھی تھا۔

شبیر علی خاں شکیب

جب میں ۱۹۳۲ء میں پہلے پہل داخلِ بزمِ شعر و سخن ہوا تو میر الرکین اور جلیل صاحب کی جوانی کا زمانہ تھا۔ ان کی بھرپور اور حسین جوانی کی طرح ان کی شاعری بھی شباب پر تھی وہ جتنی عمدہ غزل کہتے تھے، پڑھنے کا انداز بھی اتنا ہی دل کش تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس وقت بھی خواص و عوام دونوں میں مقبول و معتبر تھے۔ گو آج باعتبارِ سن وہ تریسٹھویں سال میں ہیں اور ان کا دیرپا شباب وقت اور کشاکش روزگار کے مسلسل حملوں کے سبب اپنی تابانی اور سرستی کو قائم نہ رکھ سکا لیکن ان کی شاعری آج بھی پہلے کی طرح جوان ہے۔ بلکہ خیالات کی تازگی اور فنی پختگی کی بنا پر زیادہ جاندار ہے۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا جب مقامی ادبی محفلوں میں جلیل صاحب اور ان کے تینوں بھائی بیک وقت شریک ہوتے۔ جلیل نعمانی، جمیل نعمانی، خلیل نعمانی اور شکیل نعمانی حسن صورت اور ذوق شعری ان کو اپنے والد مرحوم عزیز احمد خاں صاحب عزیز سے ترکہ میں ملا تھا۔ حق یہ ہے کہ ان سب کے دم سے مشاعرے کی رونق اور شان دوبالا ہو جاتی تھی۔ سنہ ۱۹۳۱ء کا لکھا ہوا ایک قلمی تذکرہ شعرائے رام پور کے بارے میں میری نظر سے گزرا۔ جو تذکرہ کلیم کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں جلیل صاحب کا بھی مختصر ذکر درج ہے۔ صاحب تذکرہ نے جو نہایت سخت گیر تھے اس دور کے کسی شاعر کو معاف نہیں کیا ہے لیکن جلیل نعمانی پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی۔ فرماتے ہیں۔

"جلیل احمد خاں ولد منشی عزیز احمد خاں، عمر ۲۶ سال، فربہ جسم، میانہ قد، کتابی چہرہ، آنکھیں کشادہ، ناک اوسط، دہن تنگ، رنگ گندم گوں، بال سر کے منڈے ہوئے (مراد انگریزی وضع کے بالوں سے ہے)، اردو فارسی سے واقف، آدمی طباع، بہر مذاق، یاروں کے یار۔ شاگرد شبیر۔"

یہ آج سے تقریباً چالیس سال پہلے کی رائے ہے۔ رہی اُن کی طباعی، بذلہ سنجی، پر مذاقی اور یاروں کی یاری، تو یہ کیفیت مزاج بحمداللہ آج بھی برقرار ہے۔ تخفی و بزرگی کے نازک پردے کے ساتھ ساتھ وہ میرے بے حد بے تکلف احباب میں سے ہیں اور تقریباً روز کی ملاقات رہتی ہے۔ ان کی گفتگو انتہائی دلچسپ اور پر از معلومات ہوتی ہے۔ اس عمر میں بھی وہ جوان اقبال اور بامزہ انسان ہیں۔

مندرجہ بالا تذکرے میں ان کی ایک غزل کے تین اشعار بطور نمونہ کلام دئے گئے ہیں جن سے ان کی چالیس سال پہلے کی شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے ملاحظہ ہوں۔

مرا قصہ بہت ہی مختصر ہے — مگر ظالم بعنوانِ دگر ہے
انھیں اور اعتراف بے نیازی — نہیں معلوم کیا مدِ نظر ہے
جلیلؔ ان کی نگاہ منفعل کو — نمائش چارۂ زخم جگر ہے

اس وقت رامپور کی شاعری داغؔ کی خطرناک اور مضبوط گرفت سے آزاد ہو کر رنگ جدید کی حد میں داخل ہونے کی کوشش میں مصروف تھی۔ جلیلؔ نعمانی بھی دیگر ممتاز معصر شعرائے رامپور رازؔ یزدانی، شادؔ عارفی، محشرؔ عنایتی وغیرہ کی طرح اس معرکے میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ سانپ کو مار ڈالنے کے بجائے اُس کا زہر نکال پھینکنے کے قائل معلوم دیتے ہیں۔ اور جیسا کہ ان کی بعد کی شاعری کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہو گا، غزل کی ناگن ان کے معمولی اشاروں پر رقص فرما نظر آتی ہے۔ چنانچہ متذکرہ بالا تذکرہ میں کلیم صاحب نے چند سال بعد حاشیہ پر ان کی ایک اور غزل کے چند اشعار بطور اضافہ تحریر کئے ہیں جن سے میری رائے کی تصدیق ہوتی ہے۔ شعر یہ ہیں ؎

تو کہاں صاعقۂ جلوہ گرِ ناز کہاں — دل نا واقفِ انجام ارادا کیا ہے
دے ترا رنگ تجاہل مجھے جو چاہے فریب — ورنہ تو مجھ سے یہ پوچھے کہ تمنا کیا ہے
نہیں آسان مرے دل کا مٹانا یعنی — حاصلِ تمکنت حسن ہے سمجھا کیا ہے
ایک مجھ کو نہیں دنیا کو تحیر ہے جلیلؔ — کہ ملالِ طلبِ حضرت موسیٰ کیا ہے

ان اشعار کے لہجے اور انداز بیان میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ یہ عبد الہادی خاں وفاؔ رامپوری (متوفی ۱۹۱۶ء) اور استاد پیارے خاں رازؔ (متوفی ۱۹۱۸ء) کے رنگ کلام سے مشابہ ہیں۔ بہت کم لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہو گا کہ اُردو غزل کے رنگِ جدید کی ابتدا اسی سرزمین رامپور میں قائمؔ، مومنؔ، غالبؔ اور داغؔ کے ساتھ ساتھ امیرؔ، جلالؔ اور

تسلیم لکھنوی کی مشترکہ کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔ اور جس نے دیکھتے ہی دیکھتے سارے ہندوستان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

جلیلؔ صاحب خالص غزل گو شاعر ہیں۔ غزل اور صرف غزل میں انھوں نے سب کچھ کہہ دیا ہے اور اگر کوئی خالص غزل کہنے پہ قادر ہو تو پھر اسے کس چیز کی ضرورت رہ جاتی ہے؟ اُردو شاعری کی ابتدا بھی غزل ہے اور انتہا بھی غزل ــــ غزل نظم کرنا جتنا آسان ہے، غزل کہنا اتنا ہی مشکل ہے۔ ایک کامیاب نظم نگار شاعر کے لئے جو صفات درکار ہیں اُن کے علاوہ ایک اچھے اور سچے غزل گو کے لئے کچھ "چیزے دیگر" بھی لازمی ہے۔ یہ "چیزے دیگر" رچاؤ کا دوسرا نام ہے۔ اور یہ رچاؤ دل گراختہ کی دین ہوتا ہے۔ میر جیسے صوفی مشرب والد نے اپنے کمسن بچے کو یہی نصیحت تو کی تھی کہ بیٹا عشق کبو زو عشق بساند جسے سعادت مند بیٹے نے ساری عمر حرزِ جاں بنائے رکھا۔ سوز و ساز، دل گداختگی اور جگرکاوی اس کی زندگی کا شعار، سلیقہ اور فن قرار پائے۔ اور بالآخر ایک فقیر زادہ "خدائے سخن" کے معزز ترین لقب سے سرفراز ہوا۔

ایک اچھے اور سچے غزل گو شاعر کی حیثیت سے جلیلؔ صاحب کو بھی زندگی کے یہ ہفتخواں طے کرنے پڑے ہیں۔ میرا تو ان سے تیس برس کا واسطہ رہا ہے۔ ان کی زندگی کے بیشتر حالات اور رازہائے درونِ پردہ سے کافی حد تک باخبر ہوں، لیکن جس نے انھیں کبھی نہ دیکھا ہو وہ بھی بہ آسانی اصلی جلیلؔ کو ان کے اشعار کے آئینے میں بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ آپ ان کے شعر پڑھتے جایئے، پردے اٹھتے چلے جائیں گے۔ جلوۂ بر ناز، ناز و نیازِ حسن و عشق، حسرت و ناکامی، کبھی میر کارواں کبھی گردِ راہ منزل ہونے کا احساس، ساغر کی کھنک میں شکستِ دل کی جھنکار، رندی و خدا ترسی کا حسین امتزاج، بارِ غم، ضبطِ غم اور مفاہمت غم؛ خوش مذاقی اور خوش سلیقگی کے ساتھ قدم قدم پر ان کے کلام میں آپ کو ملیں گے۔

جلیلؔ نعمانی ایک فطری شاعر ہیں اُن کی شاعری عاشقانہ شاعری ہے۔ ان کے یہاں آپ کو نہ ہیئت کے نئے نئے تجربے ملیں گے نہ روایتی موضوعات سے بغاوت، نہ الفاظ اور محاورات کے استعمال میں کوئی غیر معمولی جدت نظر آئے گی۔ وہ کسی طرزِ جدید کے موجد اور امام بھی نہیں ہیں۔ مگر نہ انھوں نے خود ان تمام باتوں کے بارے میں کبھی سوچا، اختیار کرنے کی کوشش کی ہو اور نہ دوسروں ہی نے اُن کے کلام میں ان چیزوں

کی کمی محسوس کی یا ان کا مطالعہ کیا۔ پھر وہ کیا راز ہے جس نے ان کو ایک کامیاب غزل گو شاعر بنایا اور جس کے باعث وہ رامپور جیسی سخت گیر ادبی سوسائٹی میں محترم و معتبر شاعر قرار پائے۔ یہ محض ان کے جذبے کی شدت اور خلوص کا نتیجہ ہے جس نے ان کے اشعار میں اثر آفرینی اور بے ساختگی پیدا کی۔ فارسی اور اردو شعرا کے کلام کے بھرپور مطالعہ نے ان کے مذاقِ شعری کو سنوارنے میں مدد دی۔ صاحبزادہ ننھے صاحب شبیرؔ (متوفی ۱۹۳۱ء) خلف نواب کلب علی خاں بہادر ان کے باقاعدہ استاد نہ تھے لیکن ان کی صحبت اور ان کے رنگ شاعری نے ان کی صحیح رہنمائی کی ہے۔ انھوں نے زندگی کو محض دور سے دیکھنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ زندگی کو قریب سے چھو کے اور برت کے دیکھا ہے۔ اور واثق کی طرح انھوں نے بھی " لغزشِ پا کو خمیازۂ پندارِ حواس " سمجھا ہے۔ اگر ادیبوں اور شاعروں کے ایک گروہ نے انھیں " آبروئے غزل " کے خطاب سے نوازا تو کیا غلط کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ غزل کی آبرو ہیں اور غزل ان کی آبرو ہے۔

RekhtaDownload.com

اب میں آپ کے سامنے اپنی پسند کے کچھ اشعار پیش کر رہا ہوں اس اعتراف کے ساتھ کہ مجھے مضمون کے طویل ہونے کے ڈر سے نیز دیگر مقالہ نگاروں کا خیال رکھتے ہوئے ان کے بہت سے اچھے اور بہتر اشعار کو چھوڑنا پڑا ہے۔ عام طور پر انھوں نے مترنم اور مروجہ بحروں کو استعمال کیا ہے۔ جس کی بنا پر کلام میں بھرپور رعنائیت ملتی ہے۔

نمونۂ کلام سے

ناصح یہ بتا دو مجھے سمجھانے سے پہلے   تم مل بھی چکے ہو کسی دیوانے سے پہلے

آپ ڈھونڈیں گے، مجھے میری پناہیں لیں گے   راہِ الفت میں کچھ ایسے بھی مقام آئیں گے
لاکھ آزردگیٔ شوق سے مہلت نہ سہی   پھر بھی ہم اے غمِ جاناں ترے کام آئیں گے
یوں تو جو کچھ بھی ہوا انجام شبِ ہجر مگر   وہ خیالات جو دل میں سرِ شام آئیں گے!

یہ تنگ ظرفیٔ ساقی ہے کہ محفل میں جلیل
جام آئیں گے مگر نام بہ نام آئیں گے

خود تو کعبے میں ہیں موجود نہ میخانے میں   مجھ کو در در وہ پھرایا ہے کہ جی جانے ہے
ان حسینوں نے ہم آشفتہ مزاجوں کے لئے   ایسا دستور بنایا ہے کہ جی جانے ہے

خوگرِ غم کے واسطے زحمتِ التفات کیا   میرے تمہارے درمیان رسمِ تکلفات کیا

تم سے بس ایک تغافل کا گلہ ہے ورنہ   ہم زمانے سے نرالے ہیں نہ آلام نئے

رازداری کے تو پیغام دیئے جائیں گے   امتحاناتِ سرِ دار لئے جائیں گے

چھوڑ سکتے ہیں تو چھوڑیں وہ زمیں پر چلنا   نقشِ پا دیکھ کے سجدے تو کئے جائیں گے

نویدِ فصلِ گل پہونچا تو دی تو پھر خدا جانے   قفس والوں پہ کیا گزری نگہبانوں پہ کیا گزری

ہماری توبہ سے یہ حال بزمِ ساقی کا   کہے پہ اپنے پشیماں ہیں ہم سبو لاؤ

RekhtaDownload.com

ہم کو جانا ہی پڑے گا درِ جاناں کی طرف　　اب تو دیکھا نہیں جاتا دلِ ناداں کی طرف

دیکھ آیا ہوں مستی میں شرابور وہ آنکھیں　　آنکھوں کو مری آج سے پیمانہ کہا جائے

دونوں جانب ہیں شکایات کے طومار مگر　　کوئی بھی وجہ شکایات اُدھر ہے نہ اِدھر

تم کو یہ حق ہے کہ جو چاہے وہ دینا تعبیر　　یہ بتا دو کہ مرا خواب حسیں ہے کہ نہیں

چھوٹی بحروں میں خاصی تعداد میں انھوں نے غزلیں کہی ہیں۔ ان میں بعض اشعار میں غضب کی نشتریت ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

کیا کریں گے قفس سے چھوٹ کے ہم　　اب تو دنیا بدل گئی ہو گی

بہار آئی ہے اور آتی رہے گی　　مگر وہ پھول جو مرجھا گئے ہیں

ارے دیوانے اتنی احتیاطیں　　زمانہ سوچنا بھی جانتا ہے

میں اپنے ہاتھ اکثر چومتا ہوں　　کہ ان ہاتھوں نے وہ دامن چھوا ہے

کسی امید پر سر کو جھکانا　　خودی کی موت ہے سجدا نہیں ہے

خدا حافظ ہے اب رازِ چمن کا　　نسیمِ صبح محرم ہو گئی ہے

عام تھی دعوتِ نظارہ مگر　　ہم نے دیکھا تو برا مان گئے

وہاں سے دور ہیں شیخ و برہمن　　جہاں میں سر جھکانے جا رہا ہوں

RekhtaDownload.com

دلدار نصری

علامہ نے کہا تھا۔

ذرا نم ہو تو مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی"

پختون قوم کے غیور فرزند اقبال کے عہد میں بھی برطانوی سامراج سے اس ہی طرح اس ہی طرح سے ٹکرایا کرتے تھے جیسے پشتو کے عظیم شاعر خوشحال خاں خٹک کے عہد میں مغل شہسواروں سے بھڑ جاتے تھے۔ اگر مغل فوج کی گردمندان کو کبھی ناپسند تھی تو وہ برطانیہ کی بکتر بند گاڑیوں سے بھی اتنی ہی نفرت کرتے جتنی ایک مرد آزاد طوق غلامی سے کرتا ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی سامراجی قوت برطانیہ اپنے بے شمار وسائل اور مہارت جنگ کے باوجود ان چند لاکھ نفوس کو زیر نہیں کر سکی تھی۔ مرد مومن کے تمام اوصاف اس خوددار اور غیور قوم کے فرزنداں میں موجود تھے اگر کمی تھی تو یہی کہ مٹی سخت ہی نہیں سنگلاخ بھی تھی۔ معرکہ حق و باطل میں تو یہ قوم یقیناً فولاد تھی۔ لیکن محفل احباب میں ریشم و کمخواب نہ تھی۔ نغمہ سرود تھا اور نہ گرمی شعر و سخن۔

تقریباً دو صدی پہلے کی بات ہے کہ اس سنگلاخ زمین سے ایک قافلہ چلا اور کوہ کمایوں کے دامن میں آ بسا جس میں خوشحال خاں خٹک کا پوتا بھی شامل تھا۔ جہاں ہمالہ کی فصیلیں کشور ہندوستان سر پہ دستار فضیلت رکھے کھڑی تھی۔ قدموں میں چھوٹی بڑی ہزاروں ندیاں کھیل رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکے ابر کے ٹکڑوں کو اڑا لاتے، امرت کی پھوار برسنے لگتی، کوئلیں کوکتیں، مور ناچتے، پپیہے شور مچاتے، برگد کے پیڑوں میں جھولے پڑ جاتے، لڑکیاں ملہار گاتیں۔ آم کے بور کی خوشبو سے جنگل مہک اٹھتا، چوپالوں پہ آبہا اودل کی کتھا شروع ہو جاتی۔ مندروں سے کیرتن اور بھجن کے نغمے پھوٹتے، ناقوس بجتے مسجدوں سے اذان کی صدائیں آتیں۔ مزاروں پہ قوالیوں کی محفلیں جمتیں، میلے ٹھیلے، نوٹنکی کے تماشے، کٹھ پتلیوں کے

کھیل، بازی گروں کے کمال دکھائے جاتے، کہیں کرشن کی بال لیلا دھوم مچاتی کہیں رام لیلا کا سوانگ رچتا، ہر سو ایک نیا رنگ تھا۔ دیہات میں کبیر، میرا، تلسی اور سور کا زور تھا، شہروں میں میر، سودا، قائم اور مصحفی کے ڈنکے بجتے ان کو سن کر ان کے نووارد فرزندوں کے دل میں بھی گداز پیدا ہوا۔ ہاتھ میں اب بھی شمشیر خارہ شگاف تھی۔ اور یہ شمشیر پانی پت تک ہی نہیں سرہند تک اپنی دھاک جما چکی تھی۔ دلی کی مٹتی ہوئی مغل سلطنت کی حفاظت اب روہیلہ کر رہے تھے۔ لیکن تقدیر اُم طاؤس و رباب لے کر بھی آ چکی تھی۔ نوبت اور نقارہ کے ساتھ دف کی آواز تو میدان جنگ میں بھی آ جاتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ طبلے کی تھاپ کے ساتھ بربط و طاؤس، چنگ و رباب بھی آ گئے، طنبورے، ستار، جھانجھ، مجیرے کی آوازوں میں گھنگھرو بھی بج اٹھے پائل بھی چھنکنے لگی۔ رقص اور نغمہ کے ساتھ شعر و شاعری کی شمع بھی روشن ہوئی۔ دلی اور لکھنؤ کے دربار جب سکڑے تو ارباب کمال نے ادھر کا رخ کیا۔ قائم نے اس سرزمین پر قدم رکھ کر شعراء کے لئے راستہ کھول دیا تھا۔ اب کیا تھا۔ ارباب کمال کا تانتا بندھ گیا۔ دلی اور لکھنؤ کا عطر کھنچ کر یہاں آ گیا۔ اس عہد میں رامپور نے بھی کچھ باکمال شاعر پیدا کئے۔ ان میں سے ایک کے بارے میں تو کچھ محقق آج تک سوچ رہے ہیں کہ اس کے کمال سخن کو غالب جیسے عظیم شاعر کی گود میں ڈال دیں۔ حالانکہ اس سے عظمتِ غالب میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ کچھ باکمال قعر گمنامی میں چھپ گئے جن میں سے نظام، رسا اور رونا کو یاد کر کے دل خون کے آنسو روتا ہے۔

تاریخ اپنے ورق پلٹتی رہی، زمانہ گذرتا رہا۔ اب مٹی نم ہو چکی تھی۔ اس میں جوش و خروش بھی تھا، سوز و گداز بھی، چمن میں تازہ گل کھلے، شمیم گل جو اڑی تو چمن مہک گیا۔ شاعری دربار سے نکلی اور گلی کوچوں میں اپنے جھنڈے گاڑ دیئے، رام پور کے حاشیہ کے ایک محلہ میں جس کو نالہ پار کہتے ہیں جو آفریدی قبیلہ کے لئے مخصوص تھا جلیل نعمانی پیدا ہوئے۔ والد مولوی قسم کے انسان تھے لیکن ذوق شعری تھا اس لئے نعت پر اکتفا کرتے تھے۔

صبا تو جا کر ادب سے کہنا شہ عرب کو سلام میرا
میں ہند میں ہوں یہاں وہ مضطر یہ عرض کرنا پیام میرا

کچھ والد کے اثرات، کچھ ماحول کا اثر، سب بیٹے شاعر ہوئے، جمیل نعمانی جلیل نعمانی اور پھر بیٹیوں کے بیٹے بھی شاعر ہیں' افسانہ نگار ہیں۔ غرض۔

"ایں خانہ تمام آفتاب است"

میں جب اپنے بچپن کی یادداشت کو کریدتا ہوں تو آج کے جلیل نعمانی کی بجائے ایک خوب رو، وجیہ نوجوان کا چہرہ یادوں کے گھنے تاریک بادلوں میں سے نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دوہرا اگٹھا ہوا بدن، کھڑے کھڑے نقشے، کھلتا ہوا گندمی رنگ اس طرح ایک مرد باوقار کی یاد آجاتی ہے۔ بھائی صاحب مرحوم (پھوپھی زاد) اسرار محمد خاں کی نشست گاہ میں اکثر و بیشتر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کبھی کبھی جلیل بھائی اپنے شعر سناتے اور لوگ واہ واہ کرتے۔ تعریفیں ہوتیں۔ لیکن یہ زمانہ میرے بچپن کا تھا، شعر سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ لیکن واہ واہ کو سمجھنے کے لئے کافی سمجھ دار ہوگیا تھا اس لئے ان کی شخصیت میرے لئے کافی بھاری بھر کم تھی اور یہ بات اب تک برقرار ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد ایک شادی کے سلسلہ میں راجستھان جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں خیام لاہور کا ایک پرچہ ملا۔ اس میں پہلے صفحہ پر راز یزدانی مرحوم کی غزل یا نظم جواب مجھے یاد نہیں کہ کیا تھی بہت جلی حروف میں چھپی تھی۔ راجستھان کے کچھ عزیزوں نے راز یزدانی مرحوم کی تعریف کی۔ راز صاحب رام پور کے ہیں، نہ معلوم یہ بات اس وقت مجھ کو کیسے معلوم تھی۔

رامپور میں شاعر ہوتے ہیں؟ میرے ایک ہم عمر راجستھانی دوست نے دریافت کیا۔

بہت بڑے بڑے شاعر ہوتے ہیں۔

کون ہیں وہ۔

جلیل بھائی۔ یعنی جلیل نعمانی۔

کیا کرتے ہیں وہ ؟

شعر کہتے ہیں۔

شعر کہہ کر کیا کرتے ہیں وہ ؟

سنا دیتے ہیں۔ جناب۔ اور کاغذ پر لکھے بغیر سنا دیتے ہیں۔ یعنی حفظ سنا دیتے

ہیں کہ میرے نقطہ نظر سے شعر حافظ سے سنا دینا ایک کارنامہ سے کم نہ تھا۔ کیونکہ مجھے شعر کبھی یاد نہیں رہتے تھے۔ اور خدا کے فضل سے یہ مسئلہ میرے لئے اب بھی اتنا ہی پیچیدہ اور لاینحل ہے (انتہا یہ ہے کہ اپنا شعر بھی تقطیع کرنے کے بعد ہی سنا سکتا ہوں)

وہ اپنے شعر چھپواتے کیوں نہیں ؟ میرا راجستھانی دوست بڑی حیرت سے پوچھنے لگا۔

مجھے کیا معلوم شاید انھیں چھپوانا نہیں آتا ہے۔

اس وقت تو یہ بات میں نے ان ہی جیسی بہت سی باتوں کی طرح کہی تھی جو میری عمر کے تقاضے کے اعتبار سے لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن آج سوچتا ہوں پبلسٹی کرنا بھی ایک فن ہے۔ واقعی جلیل نعمانی کو پبلسٹی کرنا نہیں آتا ہے۔ ورنہ وہ یوسف بے کارواں نہ ہوتے۔

جلیل نعمانی نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کر دیتے تھے۔ والد بلاسپور میں محرر یونٹ تھے۔ قصبہ بلاسپور میں طبیبوں کا ایک مشہور خاندان ہے۔ خاندان میں سب کے سب افراد حکیم ہیں۔ شعر و شاعری کا بھی سلسلہ ہے رام پور جب شعر و سخن کا دبستان تھا تو پھر چنگاریاں تعصبات تک کیسے نہیں اڑتیں۔ پھر بلاسپور تو افغانہ کا مرکز تھا۔ شعر و سخن کی محفلیں وہاں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ اس وقت جلیل نعمانی کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ کی نہ تھی۔ بلاسپور میں ایک منشی مالک رام تھے۔ قوم کے کائستھ سکسینہ جلیل نعمانی اس وقت انوار سہیلی ان سے پڑھا کرتے تھے۔ منشی مالک رام شاعر بھی تھے اور صدا تخلص کرتے تھے۔ مقامی مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ جلیل نعمانی کے ایک ہم عمر ہم سبق عبدالجبار نے بھی کوچہ شعر میں قدم رکھ دیا تھا۔

عبدالجبار کا تعلق حکیموں کے خاندان سے تھا۔ اور ان کا تخلص نازک تھا۔ بلاسپور میں ایک طرحی مشاعرہ ہونے والا تھا۔ اس کی خبر جب ان دونوں نوخیز شاعروں کو ہوئی تو دونوں نے طرح پر طبع آزمائی کی۔ جلیل نعمانی نے مشاعرہ میں غزل پڑھ دی۔ چاروں طرف غل مچ گیا۔ عمر تو دس سال کی تھی لیکن طبع موزوں تھی۔ اچھے خاصے شعر نکال لئے وزن، ردیف، قافیہ سب چست، ایک شعر آپ بھی سنیئے اور دس برس کے بچے کی سینہ زوری کی داد دیجئے۔

اعتبار ہرگز نہ کیجئے گا عدو کی بات کا

اس سے ڈریئے یہ ابھی قرآن اٹھا

خبر قصبہ میں عام ہوگئی اور والد کو پتہ چل گیا کہ میاں صاحبزادے غزل کہنے لگے ہیں ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ بہت سخت سست کیا۔ استاد تھے منشی مالک رام سالک۔ خود شاعر تھے۔ پیٹھ ٹھونک کر شاعری کی داد دی اور شان استادی یہ دکھائی کہ شعر کہنے کو منع کر دیا۔ حافظ رحمت اللہ صاحب نگینہ کے رہنے والے بلاسپور کے محکمہ انہار میں ٹھیکیداری کرتے تھے جلیل نعمانی ان سے شاہنامہ فردوسی پڑھا کرتے تھے ان کو اس "شعر بازی" کا پتہ چلا تو انتہائی خفا ہوئے۔ والد نے اس "بدعت" کی سزا یہ دی کہ بلاسپور سے رام پور لاکر مدرسہ عالیہ میں داخل کر دیا۔ مدرسہ عالیہ میں جلیل نعمانی کے ہم سبق تھے شاد عارفی اور راز یزدانی مرحوم۔ قسمت نے رام پور کے مستقبل کے تین اساتذہ کو یکجا کر دیا۔ طالب علمی کے زمانہ میں شاد عارفی کو شعر و شاعری سے لگاؤ نہ تھا۔ لیکن راز یزدانی اور جلیل نعمانی میں شعر گوئی میں مقابلہ تھا۔ دونوں ایکدوسرے پر برتری جتاتے اور برتری جتانے کے لئے اساتذہ کے اشعار اپنا کہہ کر سنا دیتے یہ بات جب بڑھی تو اردو سے فارسی میں پہنچی۔ راز صاحب جب حافظ کے اشعار اڑالاتے اور اپنا بنا کر جلیل خاں کو سنا دیتے۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اشعار میں مقطع بھی موجود ہوتا پھر بھی دونوں نوعمر شاعروں کو اصرار ہوتا کہ شعر ان ہی کے ہیں۔ اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیئے۔ نا معلوم یہ سرقہ کی کونسی قسم تھی۔

شاہد چوری اور سینہ زوری اس کا ہی نام ہے۔ یہ صحبت جلد برہم ہو گئی۔ لیکن چشمک دونوں بڑے شاعروں میں آخر وقت تک باقی رہی۔

جلیل نعمانی کے والد کا تبادلہ بلاسپور سے سوار کو ہوا اور انھوں نے ملازمت چھوڑ کر اپنی جگہ پر محرر یونڈ کرا دیا جلیل نعمانی کی عمر اس وقت مشکل سے چودہ پندرہ سال کی ہو گی۔ چہرے پر ایک سیاہ بال نکل آیا تھا جس کو زوران کے والد صبح کو بیدار ہوتے ہی دیکھ لیا کرتے تھے کہ موجود ہے ایسا تو نہیں ہے کہ توڑ ڈالا ہو۔ نامعلوم مرحوم کے دل میں بیٹے کا شباب دیکھنے کا کتنا ارمان تھا۔ ابھی آغاز شباب تھا کہ یہ کھودر منشی بحر سوار پہنچ گئے۔ آزادی کا ماحول چڑھتی جوانی، دیہات کی سادہ فضا! اگر قیامت بھی ٹوٹ پڑتی تو کم تھا جلیل خاں کے دل پہ تو گھاؤ ہی لگا۔ بات گو کچھ بھی نہ تھی پھر ایک معصوم صورت کو دیکھ کر دل دھڑکنے لگتا تھا۔ بیقراری بڑھی تو آہ وزاری کا دور آیا۔ شعروں میں تسکین کا ایک پہلو تھا۔ لیکن خود شعر نہیں کہا۔ اپنی حالت سے ملتے ہوئے اساتذہ کے شعر پڑھ لیتے اور سر دھنتے، وہ حسن معصوم بھی کچھ نہ کچھ متاثر ضرور تھا۔ اس دوران میں حادثات نے زندگی کا رخ موڑ دیا۔ محکمہ نے تبادلہ کر دیا۔ دل کی دنیا بسی بھی نہ تھی کہ اجڑ گئی۔ اب جس علاقہ میں تعینات ہوئے وہ جنگل بیابان نہ آدمی اور نہ آدم زاد، یہاں طبیعت نے اپنا رنگ دکھایا۔ دردِ فراق اور ہجر یار نے شاعر بنا دیا۔ زمانہ بیتا تو یہ نقش مدھم ہو گیا۔ اگرچہ کسک آج تک موجود ہے۔ پھر ایک آفت جان سے سابقہ ہو گیا۔ اب کے واسطہ دیہات کے حسن معصوم سے نہ تھا۔ جو شعر کی زبان سے نابلد ہو۔ نامۂ شوق کا جو جواب آیا اس کا عنوان یہ شعر تھا۔

تیری نگاہ سمجھتی ہے کہ دل سمجھتا ہے
وہ ایک بات جو تفصیل داستاں میں نہیں

ایک طرف جمال رنگین اور اس پر یہ سلیقہ، یہ فنکاری ادب سے یہ شغف، پھر کون ہوگا جو ایمان سلامت لے جائے۔ زبان شعر نے محسوسات کو اپنا قالب عطا کر دیا۔ طبع موزوں سے جوہر دکھائے۔ اور شعر و شاعری کا سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ نقش بنتے رہے اور مٹتے رہے لیکن کاروانِ شعر چلتا رہا۔

رام پور میں پہلا مشاعرہ جو جلیل نعمانی نے پڑھا وہ مولوی محمد حسن کے مکان پر ہوا تھا۔ اس مشاعرے کی کامیابی نے جلیل نعمانی کو خود اعتمادی عطا کی۔ اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ نوجوان شعرا کا ایک گروہ آگے بڑھ رہا تھا۔ مستقبل ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ان شعراء میں راز یزدانی، شاد عارفی، مولانا ابو طاہر، منے میاں صابر، محشر عنایتی، بدر رسکیمی وغیرہ تھے۔ ان میں سے کچھ باقی ہیں۔ لیکن استادی کی دستار فضیلت ہر ایک کے سر پہ بندھی۔ معاصرانہ چشمک اور رقابت ہر پیشہ ور میں ہوا کرتی ہے اور شاعری تو وہ بلا ہے کہ اس کی اینٹ اور روڑا بھی پکار اٹھتا ہے "ہمچو ما دیگرے نیست" اس بارے میں ہر ایک کو خبط ہے۔ ہر ایک دیوانہ ہے لیکن قبولِ عام جس کو مل جائے وہ ہی فرزانہ ہے اس وقت صاحبزادے شبیر علی خاں شبیر کا مکان رام پور کے شعراء کا مرکز تھا۔ صاحبزادے صاحب کو خود بھی شوق تھا اور قدر دان بھی تھے۔ رام پور کے بیشتر شعراء ان کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ جلیل نعمانی کی نشست برخاست صاحبزادے صاحب کے یہاں جاری ہوگئی۔ اور اس طرح طبع فکر کو جوہر دکھانے کا موقعہ ملتا رہا۔ شاگرد تو کسی کے نہیں ہوئے لیکن مطالعہ کو برقرار رکھا۔ اپنے اشعار کو اپنی کسوٹی پر پرکھا اور فن نکھرتا چلا گیا۔

مراد آباد کی نمائش میں مشاعرہ تھا۔ رام پور کے تمام خوشگو شاعر اس میں شریک تھے۔ سر یعقوب مرحوم صدارت کر رہے تھے۔ مشاعرہ طرحی تھا ایک مصرعہ سامنے کا تھا اور بیشتر شعراء کے کلام کی زینت بن چکا تھا۔

میرا دل دیکھے کوئی، میرا کلیجہ دیکھے

سامعین کو یہ مصرعہ رٹ گیا تھا جب کوئی شاعر کہتا میرا دل دیکھے کوئی، شور اٹھتا "میرا کلیجہ دیکھے"۔ خود جلیل نعمانی کے یہاں بھی یہ مصرعہ موجود تھا۔ لیکن عین وقت پر مصرعہ کا دوسرا ٹکڑا بدل گیا بس جیسے کہ الہام ہوا۔ جب شمع جلیل نعمانی کے سامنے آئی اور وہ اس شعر پر پہنچے، پہلا ٹکڑا منہ سے نکلا "میرا دل دیکھے کوئی"۔ سامعین نے شور مچایا "میرا کلیجہ دیکھے"۔ دو دفعہ جلیل نعمانی نے مصرعہ آدھا پڑھ کے چھوڑ دیا۔ سر یعقوب نے کہا آپ مصرعہ پورا پڑھتے کیوں نہیں؟

" لوگ میرا مصرعہ سن کب رہے ہیں "، یہ تھا جواب جو جلیل نعمانی نے دیا۔
اب مجمع خاموش ہوا اور جلیل نعمانی نے جب کہا۔

میرا دل دیکھے کوئی، بارِ تمنا دیکھے

تو کیا تھا محفل جھوم اٹھی، داد سے پنڈال اڑ گیا، مشاعرے کے خاتمہ پر معتقد بے مشاعرے کی بہترین غزل کا انعام جلیل نعمانی کو عطا کیا۔ جگر کے وطن سے پہلا انعام لانے والے جلیل نعمانی تھے۔

جلیل نعمانی کا عہد شباب قیامت تھا۔ خود بھی گھائل، دوسرے بھی نیم بسمل لیکن اس ژیان انگیز طبیعت نے زمین شعر میں گل کھلا دیئے۔

جلیل نعمانی خود کسی کے شاگرد نہیں ہوئے۔ اس ہی اعتبار سے شاگرد بنانے میں بھی بخل سے کام لیا ہے۔ اکلوتے اور عزیز شاگرد ہوش نعمانی ہیں اور رامپور کے نوجوان شعراء میں ان کا ایک مقام ہے۔ رام پور کے مستقبل کی شاعری ان سے توقعات باندھ سکتی ہے۔

اب جلیل بھائی سے جب کبھی ملاقات ہوتی ہے تو اپنے بچپن کا زمانہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ ان کی جوانی یاد آجاتی ہے۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ کتنے خوش پوشاک تھے جلیل نعمانی۔ اب تو وہ اپنی پچھلی شخصیت کا ایک سایہ ہیں۔ نہ کپڑوں میں نفاست، نہ چہرے پر تازگی، نہ وہ والہانہ انداز، نہ وہ جوش و خروش، امتداد زمانہ نے شوخی کو کافور کر دیا۔ فارغ البالی سے تہی دست بننے کا جتنا سنجیدہ اثر میں نے جلیل نعمانی میں دیکھا اتنا کہیں نظر نہ آیا۔

جلیل نعمانی نے جنگلات کی ٹھیکیداری میں شاید ہزاروں نہیں لاکھوں کمائے لیکن آج ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کس طرح سے وقت گذر جاتا ہے یہ وہ جانتے ہیں یا خدا جانتا ہے لیکن طبیعت کی خودداری کا وہی عالم ہے۔ وہی استغنا، وہی بانکپن، وہی تیور، روہیلوں کا خون بڑی مشکل سے ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ہو بھی جائے تو راکھ کے ڈھیر میں سے چنگاریاں نکل آتی ہیں۔ کچھ نہیں تو اپنی خاکستر کو ہی جلا جاتی ہیں۔ جلیل نعمانی آج کل اپنی خاکستر کو نذر آتش کر رہے ہیں، لیکن خون دل کی شدید

شعروں میں ڈھل رہی ہے زمانے نے ایسے چرکے لگائے ہیں کہ دل تھام تھام کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر بھی زندہ ہیں اس لئے نہیں کہ تار نفس کا سلسلہ جاری ہے بلکہ اس لئے کہ وہ زمانے کے سامنے ہتھیار ڈالنے کو آمادہ نہیں ہیں جلیل نعمانی آج بھی زندہ ہیں اور اس وقت بھی زندہ رہیں گے جب ان کا وجود باقی نہ رہے گا۔ زمانہ جلیل نعمانی کے جسم کو مٹا سکتا ہے لیکن اس آہ کو نہیں مٹا سکتا جو ہر چرکے کے ساتھ ان کے قلب سے نکلی ہے۔ وہ آہ زندہ ہے۔ روشن ہے۔ آج بھی جل رہی ہے اور آئندہ بھی جلتی رہے گی۔

RekhtaDownload.com

ذکا صدیقی

جیسے جیسے ہماری عمر بڑھتی جاتی ہے۔ یہ مسئلہ اہم تر ہوتا جاتا ہے کہ جو اقدار پانچ سات سال پہلے تک ہمیں پسند اور عزیز تھیں آج کی کسوٹی پر کھری نہ اتریں تو پھر ان کا بدل کیا ہو۔ موجودہ صدی کی پچھلی دو تین دہائیوں میں اقدار شعری اس قدر غیر متوقع طور پر بدلی اور بدل رہی ہیں کہ کبھی کبھی تو ان بدلتی ہوئی اقدار کا ساتھ دینے سے ہمارا ذوقِ شعری عاجز آتا محسوس ہونے لگتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اُردو کی سوا چھ سو سالہ تاریخ میں ادبی اور شعری روایات و اقدار نے ایسی اہم شکست و ریخت کبھی نہیں دیکھی جتنی پچھلے تیس سال میں ہوئی ہے۔ اگر اصناف شعری کے جائزہ کو صرف غزل تک محدود رکھئے تو اس وقت، بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے آغاز میں صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف تو جدید طرز کی غزل کہی جا رہی ہے جس میں اب واردات و جذبات صرف عشق ہی تک محدود نہیں رہے ہیں۔ شعریت موضوع شعر اور شعری زبان کا تصور اور مفہوم بالکل بدل گیا ہے۔ شعری حیثیت میں اس قدر انقلابات آئے ہیں کہ اگر ان کو نمبروار شروع کیا جائے تو ایک طویل مقالہ تیار ہو جائے۔ دوسری طرف کہیں کہیں قدیم طرز کی "تغزل" سے بھرپور غزل بھی کہی جا رہی ہے جس میں نرم و نازک عاشقانہ واردات و جذبات کا بیان ہوتا ہے۔ حضرت جلیل نعمانی جس قسم کی غزل کہتے ہیں وہ ان کے شخصی عاشقانہ واردات و جذبات کا بیان ہونے کے باوجود عام انسان کی اس آسودہ و یا ناآسودہ، کامیاب یا ناکام اور محروم جبلّت کا اظہار ہے جسے اصطلاح میں عشق کہتے ہیں جلیل صاحب کا عشق نہ تو صوفیوں والا امرِ لفانہ عشق ہے نہ زاہد ڈار اور میرا جی وغیرہ کا جنسی ان کا عشق ایک عام آدمی کا عشق ہے جو محبوب سے چھوٹی چھوٹی رنجشوں پر ملول ہوتے اور اس کی ذرا ذرا سی خوش التفاتیوں پر مسرور ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے ؎

تم سے بس ایک تغافل کا گلہ ہے ورنہ
ہم زمانے سے نرالے ہیں نہ آلام نئے

خوگرِ غم کے واسطے زحمتِ التفات کیا
میرے تمہارے درمیاں رسمِ تکلفات کیا

ہم کو جانا ہی پڑے گا درِ جاناں کی طرف
اب تو دیکھا نہیں جاتا دلِ ناداں کی طرف

دونوں جانب ہیں شکایات کے انداز مگر
کوئی بھی وجہِ شکایات اِدھر ہے نہ اُدھر

دل کو اب ہو گیا تخصیصِ تعلق کا یقیں
نام لے کر مرا محفل سے اٹھایا ہے مجھے

فضا ڈوبی ہوئی ہے مستیوں میں
وہ شاید گھر سے باہر آگئے ہیں

عشق کا یہ رخ غیر افلاطونی بھی ہے اور غیر فرائڈین بھی۔ دراصل یہی رخ ایک صحت مند ذہن و شعور رکھنے والے عام آدمی کے عشق کا ہوتا ہے۔ جلیل صاحب کی شاعری کا محور یہی عشق ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مخصوص طرز کے عشق کا دائرہ خاصا محدود ہے اور ہونا چاہیے۔ جلیل صاحب کی فنکاری یہ ہے کہ وہ انہی حدود میں رہتے ہوئے انسان کے اس ازلی و ابدی واحد جذبۂ سرمدی کی نازک، لطیف اور نفسیاتی تعبیر و تشریح کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ کوئی نئی زبان وضع نہیں کرتے۔ ان کا ڈکشن کم و بیش وہی ہے جو میر و سودا، یا مظہر و درد کا تھا اور ان کی شعری علامات وہی ہیں جو قدیم سے ہمارے یہاں متعارف ہیں۔

یوں تو ہر وہ لفظ جو ہم اپنی روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں علامت ہوتی ہے اس خیال کی جسے ہم ادا کرنا چاہتے ہیں، لیکن ہماری روایتی شاعری کی چند مخصوص علامات ایسی ہیں جو صدیوں کے استعمال کی وجہ سے نہ صرف جانی پہچانی ہیں بلکہ خیال کے اظہار میں بہت ہی ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ علامت کی وجہ سے ایک وسیع خیال مرکوز ہو کر شعر کے چند الفاظ میں سماجاتا ہے۔

اس طرح شعر اطناب سے بچتا ہے اور اس میں ایجاز کا حسن پیدا ہوتا ہے۔ وہی گل ہے وہی بلبل وہی بہار ہے وہی خزاں وہی قفس ہے وہی شمع ہے وہی آشیاں وہی پروانہ، وہی شام تنہائی ہے وہی شب فراق وہی ساقی ہے اور وہی شراب لیکن جب بھی علامتوں کی یہ پرانی شراب نئے مضمون، نئے تصور نئے خیال کی نئی بوتل میں آجاتی ہے تو عجیب کیف و سرور بخش جاتی ہے جلیل صاحب نے ان صدیوں پرانی علامات کے ذریعہ اپنی عاشقانہ غزل ہی میں بعض ایسے فلسفیانہ اور عارفانہ مضامین ادا کر دیے ہیں جن کو کسی اور طرح یعنی علامت کی مدد لئے بغیر یا نثر میں ادا کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ان میں وہ تاثر قطعاً نہیں ہوگا جو ان شعروں میں ہے بلکہ ان کی آفاقیت بھی ختم ہو جائے گی۔

اس معروضے کی وضاحت کے لئے اگر میں اپنا ایک ذاتی تجربہ عرض کروں تو مجھے اس کی اجازت دیجیے۔ تین مہینے قبل میری کمسن بچی کا انتقال ہوا عزیز و اقارب دوست احباب سب نے تعزیت کے بعد یہ دعا کی کہ اللہ تعالے آپ کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے۔ بلامبالغہ سیکڑوں ہمدردوں نے تعزیت کے بعد یہ دعا کی وہ بلامبالغہ ہر بار میں نے دل میں جلیل صاحب کا یہ شعر پڑھا ؎

بہار آتی ہے اور آتی رہے گی
مگر وہ پھول جو مرجھا گئے ہیں!

ذوق ہمارے نہایت محترم شاعروں میں سے ہیں۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہر بڑے اور متقدم شاعر کا ہر شعر ہمارے عصر کے ہر شاعر کے شعر سے اچھا ہو میں جلیل صاحب کے اس شعر کو ذوق کے شعر ' پھول تو دو دن بہار اپنی صبا دکھلا گئے' الخ سے کہیں زیادہ پر اثر اور پر خلوص سمجھتا ہوں۔ جہاں اس تاثر اور خلوص کی وجہ جذبے کی سادگی اور بے ساختگی ہے وہاں لہجے کا استعجاب اور لاجواب استفہام بھی ہے۔ ذوق کا شعر بیانیہ ہے۔ انھوں نے ایک statement دیا ہے جو عقلاً و عادتاً بالکل صحیح ہے، کوئی شبہ نہیں، لیکن statement شاعری نہیں ہوتا جلیل صاحب کے شعر میں بھی وہی علامتیں ہیں، بہار اور پھول۔ اصلاً ان

کے شعر کی بنیاد بھی ایک Statement پر ہے لیکن جلیل صاحب نے صغریٰ اور کبریٰ کو چھوڑ کر نتیجے سے جو ایک سوال بنایا ہے اس نے اس شعر کو میرے نزدیک اردو کے لازوال اشعار کے خزانے کا ایک درِ بے بہا بنا دیا ہے۔ ذوق کے شعر اور جلیل صاحب کے شعر میں جو فرق ہے وہ ظہوری اور خفائی ہونے کا ہے۔ میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ جلیل صاحب کا شعر ذوق کے شعر کی بہ نسبت مشہور نہیں۔ کہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ شہرت کسی شخص یا چیز کی آفاقی قدر کا معیار نہیں ہوا کرتی۔ افسوس کا مقام ہے کہ فی زمانہ مرحوم شاد عارفی کے علاوہ رام پور کے اور شاعر ادبی دنیا میں اتنے متعارف نہیں ہیں جس کے وہ مستحق ہیں۔ ہر چند کہ اب مذاق شعری بالکل بدل چکا ہے اور جس انداز کی شاعری جلیل صاحب اور ہمارے موجودہ اساتذہ کر رہے ہیں موجودہ دور شاعری کے مذاق کو دیکھتے ہوئے بہت ہی قدیم زمانے کی معلوم ہوتی ہے تاہم جلیل صاحب اور ان دوسرے اساتذہ کے یہاں شعری روایت کے احترام کے ساتھ انسانی جذبے کے روحانی ارتقا کی تعبیر و تفسیر کرنے والے اشعار اگر رامپور سے باہر نہیں پہنچتے اور اردو دنیا ان سے متعارف نہیں ہوتی تو یہ ان شاعروں کی محرومی تو ہے ہی اچھی شاعری کی بھی ٹریجڈی ہے بھلا یہ جلیل صاحب اور اردو شاعری دونوں کی ٹریجڈی نہیں تو کیا ہے کہ یہ شعر

کیا کریں گے قفس سے چھوٹ کے ہم
اب تو دنیا بدل گئی ہوگی

مشہور نہیں ہوا۔ دنیا کے بدلنے سے متعلق رامپور ہی کے ایک شاعر کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی ہوگی

میں باادب عرض کرتا ہوں کہ یہ شعر بھی ایک Statement ہے۔ لیکن حق ہے کہ بیان محض نہیں ہے۔ شعریت غزل کی روایت سے مملو ہے

تاہم انصاف شرط ہے جلیل صاحب کے شعر میں جو ربودگی و تحسّر ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔

"کیا کریں گے" کے الفاظ نے جس بیچارگی کا ماحول بنایا تھا اسے "دنیا بدل گئی ہوگی" کے احتمال نے کس قدر گہرا کر دیا ہے۔ یہی نہیں اس شعر کو سمجھنے کا ایک دور رخ ہے۔ "بدل گئی ہوگی" تک آتے آتے لہجہ استفہامیہ کر لیجئے۔ بالکل ہی بات بالکل نیا پہلو پیدا ہوتا ہے۔ شاعر اپنے مخاطب سے جو سوال کر رہا ہے کہ کیا کریں گے قفس سے چھوٹ کے ہم اس کو پورا کرتے کرتے اور دنیا کے بدل جانے کا احتمال کرتے کرتے اپنی اس آرزو کا بھی اظہار کر رہا ہے کہ کاش مخاطب یہ جواب دیں کہ نہیں، تم قفس سے باہر تو آؤ۔ تمہاری دنیا وہی ہے تمہارا ہم صفیر اب بھی تم کو برابر یاد کرتے ہیں، ان کے دل اب بھی تمہارے لئے تڑپتے ہیں۔" یہ تمام باتیں شعر میں نہیں ہیں ایک ذرا سا لہجے کو بدل کر استفہامی انداز اور ایک مخصوص حسرت آمیز اُمید کے ساتھ پڑھئے کیا کریں الخ۔ یہ معنی آپ کا ذہن خود پیدا کر لے گا۔ Statement اور شعر میں یہی فرق ہے کہ —

Statement ہمارے فہم و ادراک پر اعتماد نہیں کرتا۔ جتنی بات کہنی ہوتی ہے منطقی انداز میں مکمل کہتا ہے تاکہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ شعر ہمارے جذبے، ذہانت اور ذوق کا احترام کرتا ہے۔ وہ بات کو تمام و کمال مبتدا و خبر کے ساتھ بیان نہیں کرتا۔ ہمارے سوچنے سمجھنے کے لئے بھی کچھ چھوڑ دیتا ہے۔ اور جب ہم خود کوئی چیز اپنی ذہانت، ذوق اور شعر کی مدد سے سمجھتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ اپنے اوپر ہمارا اعتماد بڑھتا ہے بلکہ یہ بھی کہ شعر اور اس کے واسطے سے شاعر ہمیں عزیز ہو جاتا ہے۔ غالب کی عظمت کا راز یہی ہے کہ وہ اپنے قاری پر اعتماد کرتا ہے اور اس کا احترام کرتا ہے۔ جلیل صاحب کے شعر کیا کریں گے الخ میں یہی خوبی ہے۔

بالکل اسی طرح کا ان کا ایک اور شعر ہے ؎

یوں تو جو کچھ بھی ہو انجام شبِ ہجر مگر
وہ خیالات جو دل میں سرِ شام آئے ہیں

اب وہ خیالات کون سے ہیں جو سرِشام دل میں آتے ہیں؟ ان خیالات کی شدت کیوں اس قدر ہے کہ ان کے مقابلے میں شاعر کو شبِ ہجر کے انجام کی بھی کوئی پروا نہیں؟ جلیل صاحب ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ یہ سب ہمارے سوچنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اور جب ان خیالات کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں تو واقعی دل گھبرانے لگتا ہے سوچتے سوچتے واقعی ایک وقت یہ بھی آتا ہے کہ ہمیں خود اپنی شبِ ہجر کا انجام ان خیالات کے Torment کے مقابلے میں کم محسوس ہونے لگتا ہے اس شعر اور اس کی طرح کے دوسرے شعر جن کی میں نے ابھی تعبیر کی جلیل صاحب کے لئے قابلِ فخر ہیں اور ہمارے لئے قابلِ شکر کہ اگر یہ شعر نہ ہوتے تو ہم کتنے روحانی اہتزاز سے محروم ہوتے۔

مجھے جلیل صاحب کے کلام کا مطالعہ کرنے کا بالکل موقع نہیں ملا۔ مشاعروں میں بھی کبھی تو وہ تشریف نہیں رکھتے۔ کبھی میں موجود نہیں ہوتا کہ وہیں کلام شاعر بزبان شاعر زیادہ سے زیادہ سننے کا موقع ملتا۔ آج یکم اکتوبر کو مجھے رام پور آئے پورے آٹھ سال ہو گئے یاد آتا ہے کہ غالباً نومبر ۱۹۶۳ء میں فاران کراچی کا ایک شمارہ دیکھ رہا تھا۔ اس شمارے میں مولانا ماہر القادری نے فیض احمد فیض کے کلام پر تبصرہ کیا تھا۔ فیض کے کسی خمریاتی شعر پر تنقید کے دوران مولانا ماہر القادری نے لکھا تھا کہ دیکھئے اس مضمون کو جلیل رامپوری نے کس قدر پرکیف انداز میں کہا شعر یہ تھا ؂

ہوا چل کر جو بادل چھا گئے ہیں
مری آنکھوں میں ڈورے آ گئے ہیں

اب مجھے جستجو ہوئی کہ یہ جلیل رامپوری کون صاحب ہیں پھر اک نشست میں ان سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ یہ نشست غالباً پریمی رامپوری کے دولت خانے پر منعقد ہوئی تھی۔ اسی دن سے آج تک میں نے بمشکل پندرہ بیس غزلیں جلیل صاحب سے سنی ہوں گی کہ ان پندرہ بیس غزلوں کا ایک نہ ایک شعر مجھے یاد ہے۔ خدانخواستہ اس پیرے میں اپنے ذہن اور حافظے کی تعریف توصیف کروانی مقصود نہیں۔ بلکہ اس امر کا خوشی کے ساتھ اظہار کرنا ہے کہ جلیل صاحب کی تقریباً

کوئی غزل ایسی نہیں ہوتی جس کا کوئی نہ کوئی شعر یاد رکھنے کے لائق نہ ہوتا۔ میں کل اس مضمون کیلئے جلیل صاحب کے اشعار کی تلاش میں تھا۔ محترمی شکیب صاحب کے دولت خانے پر آدمی بھیج رکھا تھا کہ ان کے پاس جلیل صاحب کا انتخاب کلام ہو تو وہ زحمت کر کے مجھے بھیجدیں تاکہ میں مضمون لکھ سکوں انتظار کے اس وقفے میں ہمارے کالج کے طالب علم اور نوجوان شاعر رئیس منظر آگئے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی جب انھوں نے جلیل صاحب کے پندرہ شعر اپنے حافظے کی مدد سے کاغذ پر نقل کردیئے۔ یہ ایک اور ثبوت ہے جلیل صاحب کے کلام کی عظمت اور مقبولیت کا کہ بڑے چھوٹے سب کو ان کا کلام یاد ہے۔

اب جو میں آپ کو جلیل صاحب کے شعر بلا تبصرہ سناتا ہوں وہ محض اس لئے کہ آپ کے ذہن و دل میں یہ شعر تازہ ہو جائیں ——— اور مسرت کا احساس آپ ایک بار پھر کرنے لگیں جو آپ کو جلیل صاحب سے سن کر ہوئی ہوگی۔

خود تو کعبے میں ہیں موجود نہ بت خانے میں
ہم کو در در وہ پھرایا ہے کہ جی جانتا ہے

———

ارے دیوانے اتنی احتیاطیں
زمانہ سوچنا بھی جانتا ہے

———

مری ایک خامشی پر تو ہزار تقریریں
یہی شکر ہے کہ ناصح مرا رازداں نہیں ہے

———

عام تھی دعوتِ نظارہ مگر
ہم نے دیکھا تو برا مان گئے

———

ناصح یہ بتا دو مجھے سمجھانے سے پہلے
تم مل بھی چکے ہو کسی دیوانے سے پہلے

———

چھوڑ سکتے ہوں تو چھوڑیں وہ زمیں پر چلنا
نقش پا دیکھ کے سجدے تو کئے جائیں گے

تم کو یہ حق ہے کہ جو چاہو وہ دینا تعبیر یہ بتا دو کہ مرا خواب حسیں ہے کہ نہیں

ان اشعار کا مابہ الامتیاز زبان کی چاشنی کے علاوہ لہجے کا مردانہ پن اور بے ساختگی ہے۔

آج کی نئی تعلیم یافتہ نسل میر و غالب ہی کی زبان سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی، دکنی عہد کی تخلیقات تو شاید صحیح پڑھ بھی نہ سکے۔ جدید تر شاعری کی پیچیدہ اور بجوز دگرزیدہ زبان بھی اس احاطہ فہم سے باہر ہے۔
ایسے میں اگر وہ اس قسم کے اشعار پڑھے جیسے جلیل نعمانی کہے ہیں اور ان کو یاد رکھ سکے تو اسے شاعر اور شاعری دونوں کے لیئے نیز اردو زبان کے لیئے مغتنم شمار کیجئے جلیل نعمانی جیسا شعر کہتے ہیں اب وہ انداز ختم ہوتا جارہا ہے آئندہ ایسا شعر نہیں کہا جائے گا اس لئے ہمیں اس شاعری کو عزیز رکھنا چاہیئے۔

اسلم خاں

صدرِ محترم، بھائی جلیل، اور معزز حضرات

میں آپ صاحبان کے واسطے کوئی اجنبی نہیں ہوں۔ آپ مجھے مختلف حیثیتوں سے جانتے ہیں لیکن آج اپنی شخصیت کا Projection اس طریقے سے دے رہا ہوں کہ ایک وکیل بھی ہوں۔ جرح کرنا کہ کیا کیا پوچھا کہا جائے۔ یہ دشوار نہیں، کہیں زیادہ دشوار یہ ہے کہ کیا نہ کہا جائے۔ اس لئے پہلی بار اپنی تقریر میں یہ کر رہا ہوں کہ کیا نہ کہا جائے۔

بہت ممکن ہے ایک شعر مجھ پر وجد طاری کرے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا تجزیہ بھی کر سکوں کہ کیوں۔ چاہتا ہوں کہ قسم کھا کے کہوں کہ حضرت جلیل بہت اچھے شاعر ہیں اور یہاں ختم کر دوں!

۱۹۳۰ء میں میں نے انٹرمیڈیٹ سائنس سے پاس کیا پھر بی۔ اے میں اردو بھی مضمون لیا اور یہ بھی شوق ہوا کہ رام پور کے کون اچھے شاعر ہیں۔ پتا چلا کہ جلیل صاحب بھی اچھے شاعروں میں ہیں۔ ۱۹۳۰ء سے اب تک رام پور کے لوگ جلیل صاحب کو یہاں مستند شاعر تسلیم کر رہے ہیں تو یہ اہم بات ہے! اور ہر گروپ یہ کہتا ہے کہ مستند شاعر ہیں!!

حضرت جلیل کو جو ماحول علاوہ شاعری کے لئے سازگار ہرگز نہ تھا۔ نخوط الدین خاں صاحب، مجتبیٰ خاں صاحب کا ماحول ملا۔ اگر یہ فطری شاعر نہ ہوتے تو ہرگز یہ اچھے شاعر نہ ہو سکتے تھے۔

ان کا اسلوب میرے نزدیک اہم ہے۔ میری ذاتی رائے میں اسلوب Thought-content سے زیادہ اہم ہے۔ حافظ کے یہاں شراب و شاہد سے زیادہ کوئی مضمون نہیں ملے گا لیکن جو اسلوب اور لہجہ اور گہرائی اور اخلاص اور Personality Projection ہے اس نے انھیں عظمت بخشی۔

میں لہجہ اور اسلوب کے لحاظ سے جلیلؔ صاحب کو سب سے اول درجہ دیتا ہوں۔ میری ناقص رائے میں جو اسلوب جلیل کے یہاں آپ پاتے ہیں اس کی اہمیت یہ ہے کہ لہجہ کلاسیکل ہونے کے باوجود جدید ہے۔ ابھی ذکا (صدیقی) نے کہا کہ آج کل کی جدید شاعری کہیں سے کہیں نکل گئی ہے جب کہ جلیلؔ کی شاعر کلاسیکل شاعری ہے۔ شاعری ہو یا کوئی کام، غور یہ کرنا ہے کہ کسی کو اجتہاد کا حق پہنچتا ہے؟ غالبؔ نے کہا ہے:

با من میاویز اے پدر فرزندِ آذر را نگر
آں کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

ایسے مزے سے کہا ہے کہ کوئی مسلمان بھی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ اس شعر میں ایک Fallacy ہے جو بڑی مشکل سے deduct ہوتی ہے، شاعر کا emphasis صاحب نظر پر ہے اجتہاد کا حق اسے ہی پہنچتا ہے جو صاحب نظر ہے۔ میں جدید شاعری کے سلسلہ میں کسی ایک آدمی کو یہ حق نہیں دیتا سوائے اس کے کہ کلاسیکل شاعری ہی نئے جام میں ڈھالی جائے۔ میں جب ان سے شعر سنتا ہوں تو مجھ پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہے یہ جلیل صاحب جانتے ہیں۔

غالبؔ کی طرح وہ جس طرح بیچ کی کڑیاں حذف کر جاتے ہیں، یہ انداز عجیب لطف دیتا ہے۔

پچھلے سال میں کراچی گیا تھا۔ وہاں اسماعیل مینائی نے ۲۰۔۲۵ اشعار سنائے رامپور کے لوگوں کے بھی سنائے جن میں محشرؔ صاحب کے تو بہت سے اشعار سنائے لیکن جلیلؔ صاحب کے بھی سنائے۔

مسیح نظامی

مطلع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقطع میں آپڑے تو غنیمت ہے غالباً

میں تخلیقات سے ہٹ کے خالق سے آپ کو کیوں نہ متعارف کراؤں؛ کہ یہ ایسا خالق بن کیسے گیا؟ جبل ایسی غزل کیسے کہنے لگے؟ میں کیوں نہیں کہنے لگا؟ (بقیہ حصہ کے نوٹس نہیں لیے جا سکے۔ آخر میں انھوں نے کہا:) تاہم جیسا شاعر انھیں ہونا چاہیے تھا ویسے وہ نہیں ہوئے۔ مجموعہ کی اشاعت یا عدم اشاعت کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے، اور مجموعے ہزار شائع ہو جائیں مگر وہ تولنے اور گننے والا فرق ہو جاتا ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں جو آرا ہیں ان کا ذرل دیکھئے شمار نہیں!

اسحٰق النبی علوی

میں ۱۵۔ دسمبر ۱۹۰۴ء کو پیدا ہوا۔ اشفاق النبی صاحب میرے والد تھے۔ تعلیم باقاعدہ چوتھی درجے سے آگے نہ بڑھی۔ والد فلسفہ، تاریخ کے جاننے والے تھے ان کے پاس کتابوں کا ذاتی ذخیرہ بھی بہت عمدہ تھا۔

سب سے پہلے میں نے اپنے باغیانہ خیالات کا اعلان کیا تو والد سے دیر تک مباحثے ہوتے تھے ایک زمانے میں ملحد بھی ہو گیا تھا اور مذہب کی طرف لوٹ آنے میں فکر کم ماحول کو زیادہ دخل ہے۔

تاریخ میں مجھے زیادہ دلچسپی سامی تاریخ سامی مذاہب اور ان کے ارتقا سے رہی۔ تقویم پر میں نے جو کام کیا اس کا آغاز اس طور پر ہوا کہ میں نے سیرۃ کا مطالعہ ۱۹۴۵ء سے شروع کیا اور اندازہ کیا کہ بہت سی روایات اصولِ ریاضی کے لحاظ سے غلط ہیں، مثلاً فتح مکہ رمضان کا واقعہ بتایا جاتا ہے، اور یہ کہ اس وقت بلا کی گرمی تھی۔ تاریخ کی مطابقت کیجئے تو دسمبر کا مہینہ پڑتا تھا۔ اس سے میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ سیرۃ کے واقعات واعظین کے موضوعہ قصے ہیں۔ پھر ایک بار میں بخاری پڑھ رہا تھا کہ اتفاق سے عاشورہ کی روایات سامنے آئیں، اور اس سے ذہن میں یکایک تقویم کی مطابقت کا خیال آیا کہ ہمارے یہاں یہ موقع محرم میں پڑتا تھا! بالکل ابتدائی کام تھا، دو تین تاریخیں صحیح بھی ہو تی چلی گئیں۔ ۵۳۔۱۹۵۴ء میں، میں کچھ دن کے لئے کیرتی نگر گیا اور وہاں اطمینان کے ساتھ سوچنے اور کام کرنے کا موقع ملا۔ اور میں نے سوچا تھا واقدی میرے لئے مناسب ہے یا ابن سعد

معلوم ہوا دونوں ایک ہی تاریخ بتاتی ہیں یہاں پر آ کے مجھ پر دو تقویمی نظریہ روشن ہوا۔ میں متشکک ہی رہا مگر ۸۔۱۰ سال ہوئے یہ منزل ختم ہو گئی۔ یہ دنیا کہاں سے آئی ہم کہاں جا رہے ہیں، ہر شخص اس قسم کے امور پر سوچتا ہے میں بھی سوچتا رہا ہوں، کہ کہاں سے آیا، کہاں جا رہا ہوں؟ اور اس سلسلے میں وحدۃ الوجود کا قائل ہوں۔

اسلام نے تین وحدتیں پیش کی ہیں۔ وحدتِ الٰہ، وحدتِ انسان اور وحدتِ ادیان۔

اسلام شرک سے ہر جگہ متصادم ہے یہ وحدت الٰہ کا انتہائی درجہ ہے۔ وحدت انسان سے مراد یہ ہے کہ قرآن بتاتا ہے کہ ہمیں صرف ایک ہی جوڑے سے پیدا کیا ہے اس میں کالے گورے نقوی علوی کی کوئی اہمیت نہیں ہے Chosen People والی بات اسلام نے ختم کی جو بنی اسرائیل میں تھی۔ اور آخر الذکر کے سلسلے میں یہ عرض کرونگا کہ قرآن میں کسی بھی قدیم اچھی بات کی نفی نہیں ہے۔ اسلام اپنے پیشروؤں کا صرف اسی اعتبار سے ناسخ ہے کہ بہت سی باتوں کو تبدیل کر دیا ہے مگر سب کو نہیں۔

اسلام کو میں Revolution سمجھتا ہوں۔ اور زندگی میں کوئی بھی Revolution تلوار کے بغیر نہیں آیا کرتا۔ اس لئے اسلام پر تلوار والا الزام میرے خیال میں الزام ہے ہی نہیں۔

عالمگیر کے عہد میں جو ہندوؤں پر از سر نو جزیہ نافذ کیا گیا اس کا مطلب یہی ہے کہ انھیں اہل کتاب مان لیا گیا۔ احسان میاں، مولوی ارشاد حسین صاحب کے بڑے صاحبزادے تھے، ایک بار مجھ سے کہنے لگے میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں کہ کیا ہندو اہل کتاب ہیں؟ پھر خود ہی کہا: حضرت جلال الدین محمد اکبر نے جودھا بائی کے ساتھ شادی کی ان سے ایک صاحبزادہ پیدا ہوئے، اور صاحبزادہ حضرت شیخ سلیم چشتی کی دعا سے پیدا ہوئے! اور گویا انھیں خلیفہ بنایا گیا۔ اور ان کا نام شیخ سلیم کے نام نامی پر رکھا گیا اس سب کے کھلے معنی یہ ہیں کہ اس زمانے کے علما اور مشائخ نے Recognise کیا۔ جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے خود اورنگ زیب کی دو بیویاں ہندو تھیں۔ تو غالباً علما نے اس قسم کے فتوے دیدے ہونگے جو ہم تک نہیں پہنچے۔

جہاں تک عرشی صاحب کے اس سوال کا تعلق ہے کہ:

"کیا آپ کے خیال میں اسلامی تاریخ کی از سر نو تدوین کی ضرورت ہے؟ اور یہ تدوین کن اصولوں پر ہو؟ اور:

وہ کیا Factors تھے جنھوں نے اسلامی تاریخ میں مختلف قسم کے سیاسی اور مذہبی رجحانات پیدا کئے؟ اور جتنی مذہبی تحریکیں تھیں وہ نیم مذہبی اور نیم سیاسی تھیں یا کیا؟"

تو تدوینِ جدید کی تو یقیناً بڑی شدید ضرورت ہے اس لئے کہ بہت سی ایسی باتیں خاص عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں ہیں جو سائنٹفک اصولوں پر مدوّن ہونا چاہئیں۔ رہی تحریکوں کی بات، تو میرے خیال میں ابتدائی تحریکیں بھی سیاسی تحریکیں ہی ہیں۔

تعلیم

RekhtaDownload.com

موجودہ مسئلہ کی بنیاد ظاہرا دو چیزیں ہیں ایک تو آبادی، دوسرے

اسلم خاں Economic struggle ہے۔ لیکن ایک بات اور بھی ہے: میں بچپن میں بے حد شریر تھا والدہ سے بھی ڈرتا تھا۔ ماموں سے بھی لیکن اگر وہ کسی سلسلہ میں یہ کہہ دیتیں کہ ماسٹر صاحب سے کہہ دیں گے تو اس کا اثر ہوتا تھا۔ تو ایک طرف تو بچوں میں اخلاقی زوال آیا، اور دوسری طرف اساتذہ میں بھی۔ ویسے اس کی کنجی بھی Economics میں ملے گی۔ پہلے طلبا کی جتنی تعداد ہوتی تھی اس میں اساتذہ کا ذاتی Personal Projection ہوتا تھا ہوتے تھے۔ یہ چیز بدرجۂ اتم مدرسوں میں پائی جاتی تھی اور ایک یا دو استاد سارے مضمون پڑھاتے تھے اب یہ ہے کہ ہر گھنٹہ میں ایک نیا استاد آتا ہے اس لئے کسی ایک ذات کا پورا Projection نہیں ہوتا۔

اقبال نے کہا تھا۔ خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ + قلب افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

[illegible] جوئی ادب و دانش و فقہ + نخوری بادہ مگس از ساغر شیشہ گراں

انگریز نے جو تعلیم ہمیں دلائی اس کا ہم کتنا ہی Adverse criticism کریں لیکن اس سے ایک Indo-Anglo-Persian culture آئی اور اس سے جو نسلیں Personality ڈیولپ ہوئیں ان کا اسٹینڈرڈ آپ آج کے لوگوں سے کہیں زیادہ پائیں گے۔

آج مثلاً میں پوچھوں کہ کون بہترین مقرر ہے تو آپ کو کوئی نہیں ملے گا۔ وہ کلاس ہی نہیں آتا اب۔ پروفیسر فراق کے بقول دوسرے کلچروں کو چھوڑیئے تو Premier ہی پیدا ہوں گے۔ اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں ہم کون سا کتا پالیں۔ تو میں ان سے کہتا ہوں آپ کس کام کے لئے پالنا چاہتے ہیں۔ اگر watch-dog پالیں تو السیشن ٹھیک ہے اگر شکار مقصد ہو تو ہاؤنڈ پالئے اسی طرح دوسرے۔ تو اگر یہ طے کیا جائے کہ تعلیم کیا ہو تو پہلے یہ طے کیا جانا چاہیے کہ اس سے کام کیا لینا ہے۔ انگریز کے پاس colonies تھیں۔ انگلستان کی طرح یہاں بھی اس نے یہی کیا کہ Administrators پیدا کئے۔ ڈسپلن ہوا۔ یہ سب کچھ ہوا۔ آج ہندوستان دوراہے پر ہے اور ہمیں متعین یہ کرنا ہے کہ ایجوکیشن کو کیا کام انجام دینا ہے۔ اس کے لئے میری ناقص رائے میں چلنا یہاں سے ہوگا کہ پہلے عالم پیدا ہو یا علم؟ جنرل ایجوکیشن کا مقصد یہ ہے

کر دماغ کو ایسا ٹرینڈ (Trained) کیا جائے کہ اس کھلی کائنات کی کتاب
کو آپ کھول کے دیکھ سکیں۔ پھر Material ایجوکیشن بھی ضروری ہے۔ یورپ
میں اب سائنس اس اسٹیج پر پہنچ رہی ہے جہاں غم کو بھی دور کیا جا سکتا ہے اور یہ
Psychologically نہ کہ Physiologically
روس میں جسم کے اس حصہ کو وہ لوگ کاٹ دیتے ہیں جہاں غم ہو: اس کے بعد چاہے
اس کے لڑکے کو اس کے سامنے قتل کر دو وہ ہنستا رہتا ہے۔ اسی طرح مثبت طور
پر بھی وہ لوگ تجربے کر رہے ہیں۔ امریکا میں Atoms کی طرح Drugs پر بھی
ریسرچ ہو رہی ہے Heroin نکالی LSD وغیرہ۔ اس میں مسرت
کی جو مقدار ہے اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہپی Movement کو دیکھیے
مجھے ہنسی آتی ہے۔ شراب کو ہم نے ہمیشہ برا سمجھا لیکن پھر بھی اونچے لوگ اسے پیتے تھے
اور ہم پینے کو برا سمجھتے تھے (انھیں نیچا نہیں) گر چرس کا نام جب بھی سنا تو ہمیشہ یہی خیال آیا

کہ بھنگی قسم کے لوگ پیتے ہیں۔ لیکن ہماری غلامانہ ذہنیت دیکھیے کہ جب سنا کہ اب
یورپ میں چرس چل رہی ہے تو ہمارے شرفا میں بھی آگئی۔ ہمارے ہندوستان میں،
ہمیشہ سے، اس قسم کے ہپی ملیں گے، ملنگ سادھو وغیرہ، مگر چونکہ وہ لوگ
White ہیں اس لئے ادھر سے سلسلہ چلنے لگا۔ ابھی چند روز ہوئے ہیں نینی تال
میں تھا ایک بنچ پر دیکھا وہ لوگ without any inhibition
مصروف تھے۔ میں کہتا ہوں They will defeat their own
aims۔ تو ایجوکیشن سسٹم جو اس وقت ہے اس کے لئے جب تک سماج اور
سرکار یہ متعین نہ کرے کہ جنرل ایجوکیشن: رہنا اور رہنے دینا Live and
let others live کے اولین آداب سکھائے۔ پل صراط یہی ہے کہ ہر قول
یونٹ ہو اور ہر فعل بھی یونٹ ہو۔ پھر افلاطون نے جیسے اپنی جمہوریت کی بات کی تھی صحت
پہلے آئے گی۔ تو جیسے میں ایجوکیشن کہہ رہا ہوں اسے تربیت کہہ لیجیے۔ پھر ایجوکیشن
کی نوعیت وہ ہو جس قدر کہ ملک کو یا ہماری جمہوریت کو ضرورت ہو اور اس کی لائن وہ
ہو جیسی واردھا اسکیم تھی اور پڑھے ہو کر Manual Labour ضروری ہے،
ہاتھ پیر سے کام کرنا پڑے گا۔ آج انگلستان میں اوسط انگریز Manual
Labour نہیں کرنا چاہتا نتیجہ میں ہندوستان کے سکھوں اور پاکستان کے مسلمانوں

نے انگلستان کو ہی Colony بنانا شروع کر دیا ہے۔ انگریز کام چور ہو گئے ہیں لہٰذا باہر والے چھا رہے ہیں تین تین ہزار روپے کما رہے ہیں جو پہلے میرا لڑکا خود کام کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ انگریز ان Localities کو چھوڑ چھوڑ کے بھاگنے لگے کیونکہ باہم ایک ایک جگہ میں یہ لوگ تو دس دس بیس ملیں بھی رہ رہے ہیں تو وہ ایسوں کے پڑوس میں کہاں رہ سکے گا۔ تو یہ Manual Labour آج ضروری ہے اور دوسرے یہ کہ Vocational Training کی ضرورت ہے

اور آخر میں ایک بات میں اور کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ Planning ahead سب سے اہم چیز ہے۔ کوئی ادارہ باقی نہیں رہ سکے گا جب تک یہ نہو۔ اور اس کے لئے ہمیں اپنے سامنے تازہ ترین سائنسی فتوحات کو رکھنا ہو گا جس میں (۱) اہم ترین Automation ہے۔ امریکا میں بھاری بھاری فیکٹریوں کو ایک ایک آدمی چلا رہا ہے (۲) اسی ذیل کی چیز وہ ہے جو جادو سے آگے کی چیز ہے اور جس کے سبب ہم زمانہ کو مختصر کہنے لگے ہیں۔ (۳) پھر ان لوگوں کی بائیو کیمسٹری میں ریسرچ ہے یعنی جینس کی تھیوری کہ جس طرح کا بچہ چاہیں گے پیدا کریں گے اپنی بحث میں ان امور کو بھی پیش نظر رکھیے۔

دلدار نصری

سوال یہ ہے کہ تعلیم کا آئیڈیل کیا ہو۔ ہمارے سامنے جدید و قدیم دو لوں سسٹم ہیں۔ قدیم آشرم سسٹم تھا جو بھگتا پر چلتا تھا۔ مغل عہد میں زیادہ تر یہ ہوتا تھا کہ کسی معزز آدمی کے یہاں کوئی استاد مقرر ہو جاتا تھا جو آس پاس کے لڑکوں کو بھی پڑھاتا تھا۔ انگریزی عہد میں ذہنی اعتبار سے انگریز پیدا کرنے کا نقطۂ نظر رہا کہ وہ لوگ انگلستان سے لانے سے بچ جائیں۔

میں سمجھتا ہوں ایجوکیشن کے لفظ میں تعلیم اور تربیت دونوں شامل ہیں۔ اپنے علم کو دوسرے تک کیسے پہنچایا جائے۔ یہ بات اہم ہے اور اس کے لئے بی ایڈ، بی۔ٹی وغیرہ کو Reconstruct کرنے کی ضرورت ہے۔ فی الحال تو سلسلہ یہ ہے کہ اس میدان میں وہ آتا ہے جو زندگی کے ہر فیلڈ میں ناکام ہو چکا ہوتا ہے، خصوصاً ابتدائی تعلیم میں، اور ابتدائی تعلیم ہی اہم ترین ہے جس کے لئے ٹریننگ وغیرہ بھی ضروری سمجھی گئی ہے۔ تو اس ابتدائی تعلیم میں ایسا تھکا ہارا شخص آئے گا تو ایسا استاد کیسے نمونہ کردار پیش کر سکتا ہے۔

پھر اس مسئلہ کو بگاڑنے میں ہمارے سیاسی حضرات کا بھی خاصا رول رہا ہے جب انھوں نے جدوجہد آزادی چھیڑی تھی اس وقت سے گروہ بندیاں شروع ہوئیں۔ ہڑتالیں بھی اسی وقت شروع ہوئیں۔ آج بھی بہت سی سیاسی جماعتیں طالب علموں کو استعمال کرتی ہیں جس کے نتیجہ میں اب طالب علم یہ سمجھنے لگے کہ ان جماعتوں کے مقاصد سے الگ بھی جس مسئلہ کو چاہو ایجی ٹیشن سے پورا کرلو!

ذکا صدیقی

ایک روز دویدی جی سے باتیں ہو رہی تھیں میں نے ان سے کہا کہ آپ کے قدیم عہد میں مجھے یہ بات پسند آئی کہ تعلیم عام نہیں تھی۔ واقعتہ، میرا اب بھی یہی عقیدہ ہے۔ تعلیم عام ہونے سے اس کا مقصد فوت ہوتا جا رہا ہے۔ علم نہیں معلومات کہیئے، اس حد تک میٹرک سے تعلیم حاصل ہو جاتی ہے جو ایک اسٹیج کے لئے کافی ہے۔ لیکن اب ۸۱۔ لڑکوں کی ایک کلاس پر، جس میں سے کوئی کھڑکی میں بیٹھا ہے، کوئی کرسی کے ڈنڈے پر، کیسے پوری توجہ دی جائے۔ یہ میرے نزدیک تعلیم نہیں نشستند و گفتند و برخاستند ہے۔ یہ عام تعلیم صرف ہائی اسکول تک ہونی چاہیے۔ اس کے بعد نفسیاتی ایپیرٹیٹیس سے طالب علم کا Aptitude دیکھ کر آگے بڑھا جائے ورنہ نہیں۔

جو حیات و کائنات کے رموز انسان پر آشکار کرے میرے نزدیک وہ تعلیم ہے۔ واردھا اسکیم تمام فراڈ ہے۔ میرے نزدیک صرف علامہ اقبال والا تصور کامیاب ہے کہ

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

یہاں دین بھی وسیع معنوں میں ہے اور بزرگوں کی نظر سے مراد ہے دل و روح کی ٹریننگ اور اس کے لئے مذہب پر اساس ضروری ہے۔ کیا یہ دکھ کی بات نہیں کہ میرے طلبا حرمین کے لفظ کے معنی بھی نہ بتا سکے!

تو بنیادی تعلیم وردھا نہیں مذہب کی تعلیم ہے اور اجمالاً یہ پہلی بات کہ قرآن ناظرہ تو پڑھ ہی لے۔ فارسی ہمارے یہاں فسخ ٹائپ میں ہے جو یہ لڑکے نہیں پڑھ پاتے ہمارے لئے یہ آئیڈیل ہو سکتا ہے بیسک ایجوکیشن کا!

اور اگر انسان کی آرزو ہے تو وہ اسکولوں کالجوں میں نہیں بنتا۔ انسان تو گھروں میں بنے گا۔ اگر میری بیوی قرآن کا شعور نہیں جانتی تو میری لڑکیاں آگے چل کے بچی ہی بنیں گے۔ اقبال [illegible] اسے آئیڈیل بنایئے یعنی یہی کہ علم کی بنیاد مذہب ہو [illegible]

RAMPUR RAZA LIBRARY